مسجد نبوی میں تراویح عہد بہ عہد

مؤلف
شیخ عطیہ محمد سالم رحمہ اللہ
سابق قاضی مدینہ ہائی کورٹ
و مدرس مسجد نبوی شریف

مترجم
محمد عارف جمیل قاسمی
مبارکپوری
استاذ دار العلوم دیوبند

مکتبہ ضیاء الکتب
مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، ضلع اعظم گڈھ (یوپی) پن کوڈ 276121
Mob: 9235327576

مسجد نبوی میں تراویح عہد بہ عہد

مؤلف

شیخ عطیہ محمد سالم رحمہ اللہ

سابق قاضی مدینہ ہائی کورٹ

ومدرس مسجد نبوی شریف

مترجم

محمد عارف جمیل قاسمی

مبارکپوری

استاذ دارالعلوم دیوبند

ناشر

مکتبہ ضیاء الکتب

مدرسہ شیخ الاسلام، شیخو پور، ضلع اعظم گڈھ (یوپی)

پن کوڈ: 276121 (موبائل: 9235327576)

تفصیــــلات

نام کتاب	....	مسجد نبوی میں تراویح عہد بہ عہد
مصنف	....	شیخ عطیہ سالم رحمہ اللہ،
مترجم	....	محمد عارف جمیل قاسمی مبارکپوری
باہتمام	....	مولانا ضیاء الحق خیرآبادی
صفحات	....	144
قیمت	....	75/=
تعداد	....	1100
سنہ طباعت	....	جنوری ۲۰۱۳ء

ملنے کے پتے

- ☆ مولانا محمد عارف جمیل صاحب، استاذ دارالعلوم دیوبند
- ☆ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
- ☆ دارالمعارف دیوبند
- ☆ مکتبہ الفہیم، صدر چوک، مئوناتھ بھنجن
- ☆ مفتی محمد صادق صاحب، استاذ جامعہ احیاء العلوم، مبارکپور
- ☆ مکتبہ فدائے ملت، مرادآباد

تعارف مولف کتاب

نام: شیخ عطیۃ محمد سالم (۱۳۴۶ھ-۱۴۲۰ھ/۱۹۲۷-۱۹۹۹ء)

موصوف مصر کے مشرقی علاقہ کے مہدیہ گاؤں میں پیدا ہوئے. وہیں مکتب میں حفظ قرآن کریم اور ابتدائی تعلیم حاصل کی. ۱۳۶۴ھ میں مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور مسجدِ نبوی کے حلقوں میں دینی تعلیم حاصل کی۔ شیخ عبدالرحمٰن افریقی، شیخ حماد انصاری، شیخ محمد ترکی اور محمد حرکان وغیرہ سے موطا امام مالک، سبل السلام اور نیل الأوطار وغیرہ کے علاوہ علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں معہد علمی، اور معہد عالی ریاض میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا. عربی زبان وادب اور اسلامی شریعت میں سند حاصل کی۔ یہاں ان کے مشہور اساتذہ میں: شیخ ابن باز، شیخ عبدالرزاق عفیفی، اور شیخ عبدالرزاق حمزہ ہیں. انہوں نے دو دہائیوں تک شیخ محمد امین سنقیطی کے ساتھ سفر وحضر میں رہ کر استفادہ کیا، جن کا موصوف کی شخصیت سازی میں نمایاں اثر معلوم ہوتا ہے۔

خدمات اور کارنامے:

کلیة الشريعة رياض اور كلية اللغة العربية رياض میں تدریسی خدمات انجام دیں. ۱۳۸۱ھ میں الجامعۃ الاسلامیۃ مدینہ منورہ کے قیام کے بعد یہاں منتقل ہو گئے. اور اس کے مختلف شعبوں میں تدریسی خدمات انجام دیں.

۱۳۸۴ھ میں قضاء کے میدان میں قدم رکھا، اور چیف جسٹس کے عہدہ پر فائز رہے. ۱۴۱۴ھ میں ریٹائرمنٹ کے بعد مسجد نبوی میں مختلف علوم وفنون کا درس دیتے رہے. ان کے قلم سے بہت سی کتابیں اور رسائل نکلے. جن میں: **تتمہ تفسير اضواء البيان، تسهيل الوصول الى علم الاصول، الأدب فی صدر الاسلام، عمل أهل المدينه، تعريف عام بعموميات الاسلام، عمل أهل المدينة فی موطا الامام مالک، التراويح اكثر من ألف عام** (زیر نظر کتاب).

موصوف کی علمی حیثیت ومقام کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ۳۰ سال تک قاضی وچیف جسٹس رہے، اور مسجد نبوی میں درس دیتے رہے. ان کا درس مقبول عام وخاص ہوا کرتا تھا. علماء سعودی عرب میں جن چند علماء کو نہایت درجہ معتبر سمجھا جاتا ہے، ان میں موصوف کا نام بھی آتا ہے۔

فہرست مضامین

☆☆☆☆☆

تقــــریظ

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہٗ

شیخ محمد سالم عطیہ علیہ الرحمہ مدینہ منورہ زادہ اللہ شرفاً کے رہنے والے ایک صاحب نظر اور معتبر عالم ہیں، عدالت عالیہ کے قاضی ہیں، مسجد نبوی شریف میں مدرس تھے، اللہ تعالیٰ نے انھیں علم وعقل کا بڑا جامع توازن بخشا تھا، انھوں نے تراویح کے مسئلہ پر ایک نئے انداز سے قلم اٹھایا، پچھلی صدی میں پیدا ہونے والے ایک نئے فرقہ نے کچھ مسائل فقہیہ میں اپنی ایک شناخت ۔۔۔شاہراہ امت سے ہٹ کر۔۔۔بنائی، ان شناختی مسائل میں رکعات تراویح کی تعداد کا بھی مسئلہ ہے۔

قرون اولیٰ سے اب تک تمام ائمہ اور تمام امت کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ رمضان المبارک کی مبارک راتوں میں بعد نماز عشاء تراویح کی نماز بیس رکعات ہے، مگر اس ٹولہ نے اصرار کیا کہ تراویح صرف آٹھ رکعات ہے۔علماء نے اس موضوع پر دلائل کی روشنی میں تفصیلی بحث کی، اور قلب وذہن میں ذرا بھی سلامتی ہو تو بحث اطمینان بخش ہے، مگر جن کی آنکھوں نے سورج کو چمکتا دیکھ کر انکار کی ٹھان لی ہو، انھیں کون دکھا سکتا ہے۔تاہم امت کی سچی خیر خواہی رکھنے والے مایوسی کا دامن جھٹکتے رہے، اور نئے نئے انداز سے سمجھاتے رہے ؎

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

شیخ عطیہ سالم نے مسجد نبوی میں تراویح کے عمل کو بنیاد بنایا، کیوں کہ یہی مسجد ابتداء سے احکام وشرائع اسلامی کی بنیاد رہی ہے، پہلی مرتبہ تراویح کی نماز یہیں قائم ہوئی، حضور ﷺ کی سنتوں کا آغاز یہیں سے ہوا، یہیں سے مشہور فرمان **علیکم بسنتی و سنة**

الخلفاء الراشدين المهديين (تم کو میری سنت اور اصحاب ہدایت خلفائے راشدین کی سنت لازم ہے) جاری ہوا، شیخ موصوف نے عہد نبوت سے دور حاضر تک مسجد نبوی کی تراویح اور اس کی جماعت کا جائزہ لیا۔

انہوں نے دیکھا کہ اس چودہ سوسالہ تاریخی تسلسل میں کبھی تراویح کی جماعت آٹھ رکعات نہیں ہوئی ہے، ہمیشہ بیس رکعات پڑھی گئی ہیں، انہوں نے نہایت دیانت داری اور امانت داری کے ساتھ ان تاریخی معلومات کو مرتب کر کے امت کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

مصنف نے تاریخی تسلسل کے بیان کے بعد مشہور فقہی مذاہب: حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کی تحقیقات ونظریات بھی ذکر کئے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد چاروں ائمہ کے نزدیک تراویح بیس رکعات ہی سنت ہے، آٹھ رکعات کسی کے نزدیک سنت نہیں ہے، البتہ حنفیہ کے بیان کا مدار انہوں نے صاحب فتح القدیر **علامہ ابن الهمام** کے ایک قول پر رکھا ہے، صاحب فتح القدیر نے لکھا ہے، **و ظاهر بكلام المشائخ أن السنة عشرون ركعة و مقتضى الدليل ما قلنا** مشائخ کے قول کا ظاہر یہ ہے کہ تراویح بیس رکعات ہے، لیکن دلیل کا تقاضا وہ ہے جو ہم نے کہا۔

اسی کو حنفیہ کا مذہب قرار دیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، احناف کے نزدیک بھی پوری بیس رکعات سنت ہے، جو مصنف نے حنفیہ کی طرف منسوب کیا ہے، وہ علامہ ابن الہمامؒ کا رجحان ہے حنفیہ کا مذہب نہیں۔ (۱)

مصنف نے کتاب میں وتر کا مسئلہ چھیڑا ہے موجودہ دور میں جو ائمہ مسجد نبوی میں تراویح پڑھاتے ہیں وہ وتر کی نماز تو تین رکعت پڑھتے ہیں، مگر دو سلام سے، پہلے دو رکعت پھر ایک رکعت پڑھتے ہیں، اور دعائے قنوت تیسری رکعت میں رکوع کے بعد جہراً پڑھتے ہیں حنفیہ کے نزدیک وتر کی نماز تین رکعات ایک سلام سے ہے جیسے مغرب، اور دعائے قنوت رکوع سے پہلے ہے اور سراً ہے، اس صورتِ حال کی وجہ سے احناف سعودی امام کے پیچھے

---

(۱) حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

تراویح پڑھنے کے بعد جماعت سے الگ انفراداً وتر پڑھتے ہیں یا اپنی علاحدہ جماعت کے ساتھ پڑھتے ہیں، اس طرح ایک تشتت اور انتشار کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، مصنف کو یہ صورت پسند نہیں ہے، انھوں نے مشورہ دیا ہے کہ حنفی حضرات وتر میں الگ نہ ہوا کریں، بلکہ امام کے ساتھ وتر میں شریک ہو جائیں، انہوں نے لکھا ہے کہ صاحب فتح القدیر علیٰ شرح الہدایہ نے ابوبکر رازی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اگر کوئی حنفی غیر حنفی کے پیچھے وتر پڑھے اور امام نے دوسری رکعت پر سلام پھیر دیا تو اس حنفی مقتدی کو دو امور کا اختیار ہے۔

(١) وہ سلام نہ پھیرے اور امام کے ساتھ تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہو جائے کیونکہ محل اجتہاد ہونے کی وجہ سے امام کے سلام پھیرنے سے اس کی نماز ختم نہ ہوگی۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) تفصیل اس کی یہ ہے کہ صاحب فتح القدیر نے مصنف ابن ابی شیبہ، طبرانی اور بیہقی سے حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ: **انه ﷺ کا ن یصلی فی رمضا ن عشرین رکعة سوی الوتر** ۔ رسول اللہ ﷺ رمضان شریف میں بیس رکعات علاوہ وتر کے پڑھتے تھے۔ پھر اس روایت کو انھوں نے ضعیف قرار دیا، اور فرمایا کہ اس کے مقابلے میں حضرت عائشہؓ کی وہ روایت صحیح ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ رمضان غیر رمضان میں گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، پھر مؤطا امام مالک کی روایت بیان کی ہے کہ **کا ن النا س یقومون فی زمن عمر بن خطاب بثلث وعشرین رکعة** ۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں لوگ ٢٣ رکعات پڑھتے تھے۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ **وجمع بینھما با نه وقع اولا ثم استقر الامر علیٰ العشرین فانه المتوا رث فتحصل من ھٰذا کله ان قیام رمضا ن سنة احدی عشرة رکعة با لوتر فی جما عة فعله ﷺ ثم تر که لعذر** .... پھر لکھتے ہیں، **انما استفدنا انه کا ن یوا ظب علیٰ ما وقع منه وھو ما ذکرنا فتکون العشرون مستحباً و ذٰلک المقدا ر منھا ھوالسنة** ان دونوں کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ پہلے تراویح آٹھ رکعات پڑھی، پھر بیس رکعات پر اتفاق ہو گیا، یہی متوارث ہے، ان سب کا حاصل یہ ہے کہ رمضان کا قیام مع الوتر گیارہ رکعات سنت ہے، رسول اللہ ﷺ کی تراویح باجماعت ثابت ہے، بعد میں آپ نے اسے عذر کی وجہ سے ترک کر دیا تھا، اس گیارہ رکعت پر آپؐ نے مواظبت کی، لہٰذا بیس رکعات مستحب ہے اس میں سے اتنی مقدار آٹھ رکعات مسنون ہے، اس بحث کے بعد علامہ ابن ہمامؒ نے **و مقتضی الدلیل ما قلنا** لکھا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صاحب فتح القدیر کا یہ رجحان ہے، مذہب احناف نہیں ہے، واللہ اعلم۔

(۲)　دو رکعت پر سلام پھیرنے کے بعد اپنے امام سے الگ ہو کر نماز پوری کرے۔

بہر کیف اگر ان صورتوں پر عمل ہو تو اختلاف ختم ہو سکتا ہے، اور ہر ایک اپنے مسلک پر باقی رہے گا، کاتب حروف کے خیال میں دوسری صورت میں بھی انتشار کی ایک صورت رہ جائے گی، احناف کے لئے مناسب ہے کہ پہلی صورت کو عمل میں لائیں، مسئلہ مجتہد فیہ ہے قطعی نہیں ہے، اور تفرق و انتشار سے بچنا مطلوب ہے، نماز کے بعض اور اجتہادی مسائل میں باوجود اختلاف مسلک کے ائمہ کی اقتداء بغیر کسی تنگی کے کی جاتی ہے، مثلاً جس وقت ائمہ حرم عصر کی نماز پڑھاتے ہیں، احناف کے نزدیک ابھی ظہر کا وقت ہوتا ہے، مگر تمام احناف ان کی اقتداء میں اسی وقت عصر کی نماز ادا کرتے ہیں، اسی طرح وتر کے مسئلہ میں بھی اگر مندرجہ بالا صورت اختیار کی جائے، تو نامناسب نہ ہوگا، گو کہ جمہور احناف نے امام ابوبکر رازی کے اس قول کو قبول نہیں کیا ہے، ان کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ اگر امام وتر کی دو رکعت پر سلام پھیرتا ہے، تو اس کی اقتداء جائز نہیں، لیکن مسئلہ اجتہادی ہے، اگر تفرق و انتشار سے بچنے کے لئے ابوبکر رازی کے قول پر عمل کیا جائے، تو گنجائش ہے، **واللہ اعلم** ۔

رہا رکوع کے بعد قنوت کا مسئلہ تو حنفی مقتدی کیلئے اس میں امام کی اقتدا بے تکلف جائز ہے یہ بندہ صاحب افتاء نہیں ہے، حضرات علماء غور کر لیں۔

یہ کتاب ۱۳۹۰ھ میں لکھی گئی ہے، مگر آج بھی تر و تازہ ہے، فاضل عزیز مولانا محمد عارف صاحب مبارک پوری نے اس کو اردو لباس پہنایا، یہ ترجمہ قسط وار ماہ نامہ دار العلوم دیوبند میں شائع ہوا تھا، اب انہوں اسے کتابی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔

اعجاز احمد اعظمی

۷ / ربیع الاول ۱۴۲۵ھ

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مترجم

ہم دست کتاب: **التراويح أكثر من ألف عام في مسجد النبی عليه الصلاة و السلام** کا اردو ترجمہ ہے۔ جس کے مصنف عالم عرب خصوصاً سعودی عرب کے ایک مشہور ومعروف عالم دین شیخ عطیہ محمد سالم رحمه الله ہیں۔ موصوف مسجد نبوی کے مدرس اور مدینہ منورہ ہائی کورٹ کے جج رہے ہیں۔ اصلاحی اور دعوتی موضوعات پر ان کی کئی کتابیں ہیں۔ جس سے ان کی بلند پایہ علمی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عصر حاضر میں ایک رجحان یہ پیدا ہوگیا ہے کہ معمولی معمولی غیر ضروری مسائل چھیڑ کر امت میں انتشار وافتراق پیدا کیا جائے۔ ان ہی میں سے ایک: تراویح کا مسئلہ ہے۔ آج کچھ لوگوں کی طرف سے آٹھ رکعات سے زیادہ تراویح کو بدعت قرار دیا جا رہا ہے، حالاں کہ مصنف کتاب کی تصریح کے مطابق آٹھ رکعات باجماعت تراویح کا ثبوت ، اسلامی خصوصاً مسجد نبوی کی تاریخ میں نہیں ملتا۔

اس موضوع پر ماضی اور حال میں مذاہب اربعہ کے ائمہ اور علماء نے نہ جانے کتنی مستقل کتابیں لکھیں اور ضمناً فقہی کتابوں میں اس پر بحث کی ہے۔ برصغیر میں بھی اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

ہندستان میں یہ مسئلہ ایسے لوگوں کی طرف سے اٹھایا جا رہا ہے جو اس ملک کے علماء سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے نہیں تھکتے خود جہاں آٹھ رکعات پر عمل نہیں ، جہاں کے علماء بیس

رکعات ہی تراویح پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، حرمین کا یہی معمول رہا ہے۔ لہذا اس کتاب کا ترجمہ شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

یہ ترجمہ نوقسطوں میں دارالعلوم دیوبند کے ترجمان ماہنامہ دارالعلوم میں اب سے تقریبا چار سال قبل شائع ہو چکا ہے، جس پر نظر ثانی کے بعد کتابی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالی اس کتاب کو مفید اور امت اسلامیہ کی صف میں اتحاد و یگانگی کا ذریعہ بنائے۔

محمد عارف جمیل مبارک پوری
یکم ربیع الاول ۱۴۲۵ھ
مبارک پور

☆☆☆☆☆

اضافہ طبع دوم

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن فرید بک ڈپو دہلی سے ۸ سال قبل شائع ہوا تھا۔ اور اس وقت کمیاب ہے، ارادہ تھا کہ اس پر نظر ثانی کر کے دوبارہ شائع کیا جائے، مگر فرصت کے انتظار میں تاخیر پر تاخیر ہوتی جارہی ہے، اس لئے معمولی ترمیم اور اغلاط کی تصحیح کے بعد اسے شائع جارہا ہے۔ میرے عزیز دوست مولانا ضیاء الحق صاحب خیر آبادی کی نگرانی میں ان کے مکتبہ ضیاء الکتب شیخوپور، اعظم گڈھ سے یہ دوسرا ایڈیشن شائع ہورہا ہے، جس کے لئے میں ان کا تہ دل سے مشکور ہوں، باری تعالیٰ مولف، مترجم اور ناشر ہر ایک کو اپنے شایان شان اجر عطا فرمائے اور کتاب کے نفع کو عام اور تام فرمائے۔

محمد عارف جمیل مبارک پوری
دارالعلوم دیوبند
اتوار ۲۹ صفر ۱۴۳۴ھ/۱۳ جنوری ۲۰۱۳ء

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

(از: مؤلف)

اللہ تعالیٰ نے ماہ رمضان کو پوری امت کے لئے عید اور مسلمانوں کے لئے باغ و بہار بنایا ہے ۔ یہ مبارک مہینہ اپنے ساتھ، دلوں کے لیے خوشی اور انس کا سامان لے آتا ہے۔اس میں سرگرمی بڑھتی ہے اور عبادتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔خصوصاً حرمین شریفین، خلائق کا مرجع بن جاتے ہیں،لوگ زیادہ سے زیادہ ثواب کے ذریعہ اپنے دامن کو بھرنے کے لیے اُمڈ آتے ہیں۔ان کے دلوں میں یہاں کی شان دار تلاوتِ قرآن سے محظوظ ہونے کا جذبہ لبریز ہوتا ہے۔اور انسان یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ کاش سارا سال رمضان ہو اور سارا رمضان تراویح!

مجھے یہ کتاب لکھنے کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی، جب میں نے بعض برادرانِ اسلام کو دیکھا کہ وہ امام کے ساتھ، آٹھ رکعات تراویح پڑھ کر رک جاتے ہیں۔اس کے بعد وہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں یا مسجد سے باہر چلے جاتے ہیں۔اس کا سبب ان کی کوتاہی یا کاہلی نہیں بلکہ اپنے اجتہاد کی بنیاد پر ایسا کرتے ہیں، وہ حضرت عائشہؓ کی اس حدیث سے متاثر ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں آٹھ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔

اس حدیث کی بنیاد پر انہوں نے آٹھ رکعات ہی کو اختیار کیا، ان کا خیال ہے کہ اس سے زیادہ پڑھنا ناجائز ہے یا یہ کہ آٹھ رکعات ہی پڑھنا افضل ہے۔ان کے پیش نظر افضل پر عمل کرنا ہے۔

ان کی نیک نیتی،حسن مقصد، محنت و کوشش، اور مسئلہ کا نفل کی حد میں ہونا، یہ تمام

چیزیں ان کے لیے عذر پیدا کرتی ہیں۔تاہم ان کی خیر خواہی اور انھیں فائدہ پہنچانے کے جذبہ سے، نیز مسجد نبوی میں جماعت کے ترک کی وجہ سے ان کی محرومی پر افسوس کے سبب، ہم یہ کتاب پیش کر رہے ہیں۔شاید اس میں ان کے لیے، حسن مقصد اور نیک نیتی کا مکمل سامان مل جائے، **ان شاء الله تعالیٰ**۔

جو لوگ عشاء کی نماز پڑھ کر فوراً مسجد سے نکل جاتے ہیں اور کسی دور دراز کی مسجد میں جا کر آٹھ رکعات پڑھتے ہیں، ان سے ہمیں بہت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ ہم نے پہلے ہی ان کو بتا دیا ہے کہ نہ تو تم نے سنت پر عمل کیا، کیوں کہ آدمی کی بہتر نماز وہ ہے جو اس کے گھر میں ہو، فرض نماز اس سے الگ ہے۔اور نہ ہی تم نے ثواب سے اپنے دامن کو بھرا، کیوں کہ حدیث میں ہے: ''میری اس مسجد میں ایک نماز، دوسری مسجدوں کی ایک ہزار نمازوں سے بہتر ہے''۔

شاید ان حضرات نے اپنے اس عمل کو ترک کر دیا ہے اور مسجد میں تراویح پڑھنے لگے ہیں، اس کے اسباب و محرکات جو بھی ہوں، اس سے ہمیں سروکار نہیں۔

اس کتاب کا پہلا اور آخری مقصد، عام لوگوں کی خدمت ہے، یہ مسجد نبوی سے متعلق، ایک ہمہ گیر، وسیع معلوماتی منہج کا ایک جزء ہے۔یہ اس ارادہ سے لکھی گئی ہے کہ اسلام میں، مسجد نبوی کی، دینی و معاشرتی حیثیت اور اس کی خصوصیات کو اجاگر کرنے کے لیے ایک جامع کتاب کا کام دے، و باللّٰه التوفیق۔

اس کتاب کو شروع کرتے وقت ہمارے پیش نظر یہی ہے کہ مسجد نبوی کے ساتھ، تراویح کو، تاریخی تسلسل کے ساتھ مربوط کیا جائے؛ کیوں کہ مسجد نبوی (**علی صاحبه الصلاة واتم التسلیم**) اس تاریخی تسلسل کی زیادہ مستحق ہے۔

مؤلف

عطیہ

☆☆☆☆☆

اوّلاً: عہد نبوی

بلاشبہ شریعت کی اصل اور آغاز، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، آپ کا عہد ہی، عہد تشریع ہے، کیونکہ فرمان باری ہے:

وَمَآ اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (سورہ حشر/۷)

ترجمہ: اور رسول جو تم کو دے لے لو اور جس سے منع کرے اسے چھوڑ دو۔

نیز: لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورۂ احزاب/۲۱)

ترجمہ: تمہارے لیے بھلی تھی سیکھنی رسول اللہ کی چال۔

ان کے علاوہ اور دوسری نصوص اس کی دلیل ہیں۔ خلفاء راشدین کا عہد اسی کے ساتھ لاحق ہے، کیونکہ فرمانِ نبوی ہے:

''میری سنت اور میرے بعد خلفاء راشدین کی سنت کی پابندی کرو۔''

تراویح رمضان المبارک کے ساتھ خاص ہے، تاہم یہ قیامِ لیل کے عموم میں آتی ہے۔ عموماً قیامِ لیل اور خصوصاً تراویح کے تعلق سے بہت سی نصوص وارد ہیں۔

تہجد (قیامِ لیل) کے تعلق سے عمومی نصوص میں سے یہ فرمانِ باری ہے:

وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّکَ) [سورہ بنی اسرائیل/۷۹]

ترجمہ: اور کچھ رات جاگتا رہ قرآن کے ساتھ، یہ زیادتی ہے تیرے لئے۔

نیز: (يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا) [سورہ مزمل ۱۔۲]

ترجمہ: اے کپڑے میں لپٹنے والے! کھڑا رہ رات کو مگر کسی رات۔

قیامِ رمضان (تراویح) اوقات کے لحاظ سے تو خاص ہے لیکن مطلوب ہونے کے لحاظ سے عام ہے۔

تراویح کی بہ تدریج مشروعیت:

تراویح کے بارے میں نصوص پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بہ تدریج ترقی ہوتی گئی ہے، جو حسب ذیل ہے:

(ا) مطلقا ترغیب: مسلم شریف (کتاب المسافرین باب الترغیب فی الدعاء والذکر فی آخر اللیل [۱۷۳] ۱/۵۲۳ ط: محمد فواد عبد الباقی) اور بیہقی (۴۹۲/۲ ط: مکتبہ دار الباز مکہ مکرمہ) میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جس نے ایمان کے ساتھ، ثواب کی نیت سے، رمضان کا قیام کیا اس کے پچھلے گناہ معاف ہو گئے''۔

امام بیہقی نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرمایا: اس کو امام مسلم نے ''صحیح'' میں بروایت یحییٰ بن یحییٰ اور امام بخاری نے بروایت عبداللہ بن یوسف بن مالک نقل کیا ہے۔

بیہقی میں یہی روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے۔ امام بیہقی نے اس کو نقل کرنے کے بعد فرمایا: اسکو امام بخاری نے بہ روایت یحییٰ بن بکر نقل کیا ہے۔

بہر کیف اس روایت سے مطلقاً ترغیب معلوم ہوتی ہے، کسی تعداد یا کیفیت کی تعیین نہیں۔ اسی وجہ سے بیہقی میں حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ قول منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہم کو رمضان کے قیام کی ترغیب دیتے تھے؛ لیکن عزیمت کے طور پر حکم نہیں دیتے تھے۔ آپ فرماتے تھے: جس نے ایمان کے ساتھ، ثواب کی نیت سے رمضان کا قیام کیا اس کے پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔

(ب) اس کے بعد رمضان کے روزے کی فرضیت کے ساتھ، قیام رمضان کے مسنون ہونے کی تصریح آئی۔ حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ماہ رمضان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''اللہ تعالی نے اس کے روزے کو فرض قرار دیا ہے اور میں نے مسلمانوں کے لیے

اس کے قیام کو مسنون کیا۔ لہٰذ جس نے ایمان کے ساتھ، ثواب کی نیت سے، رمضان کے روزے رکھے اور قیام کیا، وہ گناہوں سے اس طرح صاف ستھرا ہو گیا جیسا کہ اس دن تھا جب اس کی ماں نے اس کو جنم دیا۔‘‘(۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تراویح مطلقاً مطلوب ہونے کے بعد ترقی کر کے سنت ہوگئی، روزہ کی فرضیت کے ساتھ اس تذکرے سے، اس میں مزید قوت پیدا ہوگئی ہے جیسا کہ اصول فقہ میں دلالت اقترانی کا یہی حاصل اور مفاد ہے۔

اس ترغیب کا نتیجہ:

اس ترغیب کے نتیجہ میں انفرادی اور اجتماعی طور پر قیام رمضان کے لیے سبقت ہوئی، جس کے ساتھ بھی کچھ قرآن یاد ہوتا، لوگ اس کے پیچھے قیام رمضان کرنے لگے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

’’لوگ مسجد نبوی میں، رمضان میں، بوقت شب متفرق طور پر قیام رمضان کرتے تھے۔ کسی کو کچھ بھی قرآن یاد ہوتا تو اسکے پیچھے پانچ چھ افراد یا کم وبیش کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے حضرت عائشہ کہتی ہیں ایک رات رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم فرمایا کہ اپنے حجرے کے دروازے پر چٹائی ڈال دوں۔ عشا پڑھنے کے بعد آپ اس جگہ تشریف لے گئے۔ مسجد میں جو لوگ موجود تھے، آپ کے پاس جمع ہو گئے آپ نے دیر رات تک ان کو نماز پڑھائی، پھر آپ اندر لوٹ آئے۔ میں نے چٹائی اسی حالت میں چھوڑ دی۔ صبح کو لوگوں میں چرچا ہوا کہ رات میں جو لوگ مسجد میں تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان کو نماز پڑھائی ہے۔ تو پھر کیا تھا، شام کو مسجد بھر گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھائی۔ اور اندر تشریف لائے۔ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے مجھ

---

(۱) مسند احمد ۱۲۸/۳ تحقیق احمد شاکر ط: دار المعارف میں ہے: ابو مسلمہ بن عبد الرحمان نے کہا: میرے والد نے مجھ سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بیان کیا کہ اللہ عز وجل نے رمضان کا روزہ فرض کیا اور میں نے اس کے قیام کو مسنون کیا۔ لہٰذا جس نے ایمان کے ساتھ، ثواب کی نیت سے روزہ رکھا اور قیام کیا وہ گناہوں سے اس طرح پاک وصاف ہو گیا جیسا کہ اس دن تھا جس دن اسکی ماں نے اس کو جنم دیا تھا۔

سے فرمایا: کیا بات ہے؟ میں نے بتایا کہ رات کی نماز کا لوگوں میں چرچا ہوا، تو آپ کے پیچھے نماز کے لیے یہ بھیڑ لگی ہے۔ آپ نے فرمایا: عائشہ! چٹائی لپیٹ دو۔ میں نے لپیٹ دی۔ رسول اللہ ﷺ نے رات بے خبری میں نہیں گذاری (بلکہ عبادت میں)، لوگ اپنی جگہ ٹھہرے رہے۔ اور جب رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز کے لئے تشریف لے گئے تو فرمایا: لوگو! بخدا میں نے رات بے خبری میں نہیں گذاری، الحمدللہ۔ مجھے تمہاری موجودگی کا علم تھا لیکن مجھے یہ اندیشہ ہوا تھا کہ یہ تم پر فرض ہو جائے۔ تم بہ قدر طاقت عمل کیا کرو کہ اللہ تعالی (ثواب دینے سے) نہیں اکتاتا، بلکہ تم اکتا جاؤ گے۔

مروزی (کی کتاب **قیـــام الـلـیـل** کے الفاظ یہی ہیں، اس روایت کو امام بیہقی (١٠٩/٣) نے بھی نقل کیا ہے۔ اور انہوں نے راتوں کی تعداد تین یا چار لکھی ہے۔ مجمع الزوائد (١٧٢/٣ ط: **دار الفکر بیروت**) میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے ہمیں رمضان میں آٹھ رکعات اور وتر پڑھائی۔ اگلی رات ہم، مسجد میں، اس امید سے جمع ہوئے کہ آپ تشریف لائیں گے، لیکن آپ تشریف نہ لائے، یہاں تک کہ صبح ہوگئی، پھر ہم داخل ہو گئے۔ **الحدیث**، اصل حدیث بخاری اور مسلم میں ہے۔

مجمع الزوائد (١٧٢/٣) اور بیہقی (٤٩٦/٤) میں ہے :

''رسول اللہ ﷺ نے رمضان میں بیس رکعتیں پڑھائیں''۔ یہ روایت ابوشیبہ کے سبب ضعیف ہے۔ مروزی کی روایت کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کو کچھ بھی قرآن یاد ہوتا لوگ اس کے پیچھے نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ یعنی ترغیب سے ترقی کر کے، فرضیت صوم سے متصل، سنیت کا مرحلہ، پھر بالفعل مسجد نبوی میں معمولی حافظ قرآن کے پیچھے قیام، پھر اگلا مرحلہ خود رسول اللہ ﷺ کیساتھ قیام اور آپ کی اقتدا میں نماز پڑھنا، گوکہ (صحیح روایت کے مطابق) آپ کو احساس نہیں ہوا تھا کہ لوگ آپ کے پیچھے پڑھ رہے ہیں۔ جس کی دلیل حضرت عائشہؓ سے آپ کا یہ دریافت کرنا ہے کہ کیا بات ہے؟ پھر آپ کا یہ فرمانا کہ چٹائی لپیٹ دو۔

اس سے زیادہ صریح روایت مروزی کے یہاں حضرت انس ﷺ کی حدیث ہے کہ:
رسول اللہ ﷺ رمضان میں نماز پڑھ رہے تھے میں آ کر آپ کے پہلو میں کھڑا ہو گیا پھر دوسرے پھر تیسرے صاحب آ گئے اور پھر ایک جماعت بن گئی۔ جب اپنے پیچھے ہماری موجودگی کا احساس آپ کو ہوا تو آپ نے نماز مختصر کی اور گھر میں چلے گئے۔
صبح ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! رات ہماری موجودگی کا احساس آپ کو ہو گیا تھا؟ آپ نے فرمایا: ہاں، پھر میں نے جو کچھ کیا اسی وجہ سے کیا تھا۔
اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاً آپ کو احساس نہیں ہوا تھا کیوں کہ حضرت انسؓ نے کہا: جب اپنے پیچھے ہماری موجودگی کا آپ کو احساس ہوا۔
اسی طرح اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ نماز مسجد ہی میں شروع فرمائی تھی، کیوں کہ حضرت انس نے کہا: آپ نے نماز مختصر کی اور گھر میں چلے گئے۔ نیز اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ان کی نماز کا علم ہوا، اور آپ نے ان پر نکیر نہیں فرمائی۔
حضور ﷺ نے یہ نماز مسجد میں پڑھی تھی، اس کی مزید صریح دلیل بیہقی میں حضرت عروہ بن زبیر کی روایت ہے کہ ان کو حضرت عائشہؓ نے بتایا کہ ایک بار آدھی رات کو رسول اللہ ﷺ مسجد میں نماز پڑھنے کیلئے نکلے، تو کچھ لوگوں نے آپ کے پیچھے پڑھی، صبح کو لوگوں میں اس کا چرچا ہوا۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے چوتھی رات تک آپ کی نماز کا واقعہ بیان کرنے بعد فرمایا: مسجد تنگ پڑ گئی، آپ باہر نہیں نکلے۔
اس روایت سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے لئے آپ مسجد میں تشریف لے گئے تھے، نیز معلوم ہوتا ہے کہ مسجد بھر گئی تھی۔
یہ اگلا قدم تھا، یعنی پہلے لوگ ادھر ادھر متفرق طور پر پڑھتے تھے، اب مسجد بھر گئی، اور تنگ پڑ گئی، لیکن حضور ﷺ فرضیت کے اندیشہ سے باہر تشریف نہ لائے۔
حضور ﷺ کے لئے نکلنا ممکن تھا، اگر یہ علت (فرضیت کا اندیشہ) نہ ہوتی، معلوم ہوا کہ لوگوں کو یہ نماز پڑھانا اور اس کے لیے لوگوں کا اجتماع جائز ہے۔ لیکن حضور ﷺ نے شفقت

کے سبب اور اس اندیشہ سے کہ ان پر فرض ہو جائے، اور وہ اس کو پورا نہ کرسکیں، آپ نے پھر ان کو نماز نہیں پڑھائی۔ گھروں میں اور مسجد میں کسی جگہ عام لوگوں کے لیے جماعت سے تراویح کی حضور ﷺ نے تائید فرمائی ہے گھروں سے متعلق مروزی کے یہاں حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ ابی بن کعب رمضان میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے ساتھ رات ایک معاملہ پیش آ گیا'' آپ نے فرمایا: کیا ہوا؟ انہوں نے کہا: میرے گھر کی عورتوں نے کہا: ہمیں قرآن پڑھنا نہیں آتا، آپ پڑھیں تو ہم نے آپ کے پیچھے نماز پڑھ لیں، میں نے ان کو آٹھ رکعات پڑھائی'' حضور ﷺ خاموش رہے، جو گویا آپ کی رضامندی ہے۔ مسجد سے متعلق مروزی ہی کے یہاں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ، رمضان میں مسجد کے ایک گوشے میں نماز ادا کررہے ہیں، آپ نے دریافت فرمایا: یہ کون ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ کچھ ایسے لوگ ہیں جن کو قرآن یاد نہیں، ابی بن کعب ان کی امامت کررہے ہیں اور وہ ان کے پیچھے نماز ادا کررہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: انہوں نے اچھا کیا یا (فرمایا:) انہوں نے کیا خوب کیا۔

اس کے بعد اخیر سے قبل کا مرحلہ ہے۔ جس کا ذکر مروزی کے یہاں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

> ''رسول اللہ ﷺ اپنے گھر والوں کو اکیسویں رمضان کی شب میں جمع کرتے، اور ان کو تہائی رات تک نماز پڑھاتے، پھر بائیسویں کی رات کو جمع فرماتے، اور آدھی رات تک ان کو نماز پڑھاتے، تیئیسویں کی شب کو انہیں جمع فرماتے اور دو تہائی رات تک نماز پڑھاتے پھر چوبیسویں رات ان کو غسل کرنے کا حکم دیتے اور صبح تک انہیں نماز پڑھاتے اس کے بعد ان کو جمع نہیں کرتے تھے''۔

اس روایت سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے گھر والوں کے ساتھ تین راتوں کو قیام کرتے، جس کی مدت مختلف تھی۔ بہ تدریج اول شب کو تہائی رات، دوم کو آدھی رات اور

سوم کو دو تہائی رات تک ۔ یہ مستبعد نہیں کہ آپ کے اس عمل سے یہ سمجھا جائے کہ آپ نے رغبت خیر اور اندیشہ فرضیت کے درمیان عمل کیا، کیوں کہ یہ عمل عشرہ اخیرہ کا ہے جو مزید رغبت کا محل ہے ۔اسی طرح بہ تدریج اس مدت قیام کو بڑھانا اسی رغبت پر عمل کرنا ہے ۔اسی طرح اخیر رمضان تک اس کو جاری نہ رکھنے سے،فرضیت کا اندیشہ سمجھ میں آتا ہے ۔اس کے بعد تدریج کا آخری مرحلہ آیا۔جس کا ذکر حضرت ابوذر کی روایت میں ہے،اس روایت کے متعلق ''المنتقٰی'' (۵۴/۳ مع نیل الاوطار، ط: دار الکتب العلمیہ بیروت) میں ہے:اس کو خمسہ نے روایت کیا اور ترمذی نے اس کی تصحیح کی ہے ۔نیز اس کو بیہقی (۴۹۶/۲) نے روایت کیا۔سنن میں اس کے الفاظ یہ ہیں:''ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رمضان کا روزہ رکھا،لیکن کسی رات آپ ﷺ نے ہمارے ساتھ قیام نہیں کیا جب تیئیس کی رات آئی تو آپ ﷺ نے ہمارے ساتھ قیام کیا، جو تقریبا تہائی رات تک جاری رہا۔چوبیس کی رات کو آپ نے ہمارے ساتھ قیام نہیں کیا، پھر پچیس کی رات کو آپ نے ہمارے ساتھ قیام کیا جو نصف شب تک جاری رہا۔ہم نے عرض کیا : اے اللہ کے رسول ! کاش بقیہ رات بھی آپ نفل پڑھاتے رہتے !۔آپ نے فرمایا:''اگر آدمی امام کے ساتھ قیام کر کے لوٹ جائے تو اس کے لیے بقیہ رات کا ثواب لکھ دیا جائے گا''۔چھبیس رمضان کی رات کو آپ نے ہمارے ساتھ قیام نہیں فرمایا،اور ستائیس کی رات کو قیام کیا۔اور اپنے گھر والوں کو کہلا بھیجا،لوگ جمع ہو گئے ۔یہ قیام اتنی دیر تک جاری رہا کہ ہمیں سحری کے چھوٹنے کا اندیشہ ہونے لگا۔

امام بیہقی نے کہا: اس روایت کو وہب نے داؤد سے روایت کیا، انہوں نے کہا: چوبیسویں رات کو بقیہ کا ساتواں حصہ۔اور کہا: چوبیسویں رات کو باقی کا پانچواں حصہ، اور اٹھائیسویں رات کو باقی کا تیسرا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تراویح اس حد تک پہونچ گئی کہ اس کیلئے اجتماع ہوا اور رسول اللہ ﷺ نے اسکی تائید وتقریر فرمائی، کیونکہ صحابہ نے آپ سے عرض کیا تھا کہ کاش بقیہ رات بھی آپ ہمیں نفل پڑھاتے رہتے ۔اس سے دو چیزیں سمجھ میں آتی ہیں:

اول: مسجد میں لوگوں کے اجتماع کا آپ ﷺ کو علم ہوا اور آپ نے اسے برقرار رکھا جیسا کہ ستائیسویں رات کو اپنے گھر والوں کو کہلوا بھیجنے کا ذکر ہے، اس کی تائید اس صحیح روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اخیر عشرہ میں مضبوطی سے تہبند باندھ لیتے، بستر لپیٹ دیتے، اور اپنے گھر والوں کو بیدار کرتے۔(۱)

دوم: آپ نے تعداد رکعات کی تحدید نہیں فرمائی اور جب لوگوں نے رات کے بقیہ حصہ میں مزید پڑھانے کی درخواست کی تو آپ نے اس مطالبہ کی تائید وتقریر کی، اس پر نکیر نہیں کی۔ ہاں آپ نے لوگوں کو اس سے بہتر کی رہنمائی فرمائی کہ امام کے ساتھ قیام کرنے کے بعد لوٹ جائے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ حضرت جویریہ (ام المومنین) کے واقعہ میں ہے کہ آپ ﷺ کا ان کے پاس سے گزر ہوا وہ کنکری یا گھٹلی پر تسبیح پڑھ رہی ہیں۔ آپ واپس آئے تو پھر ان کو اسی حالت میں دیکھا تو فرمایا: میں نے ایسے کلمات کہے ہیں جو تمہاری تسبیح کے برابر ہیں، وہ یہ ہیں: ''**سبحان الله و بحمده عدد خلقه، رضا نفسه، زنة عرشه ومداد كلماته**''۔

آپ ﷺ نے ان کے عمل پر نکیر نہیں فرمائی، ہاں ان کو اس سے بہتر کی رہنمائی کر دی۔ اسی طرح یہاں پر بھی رسول اللہ ﷺ نے مزید پڑھانے کے صحابہ کے مطالبہ پر نکیر نہیں فرمائی، ہاں اس سے بہتر، بلکہ اس کے مساوی عمل کے رہنمائی فرمادی۔

الحاصل اس سے، مسجد میں امام اور مقتدیوں کے ساتھ باجماعت نماز کا ثبوت ہے اور اس سے جماعت کے ساتھ آپ ﷺ کی امامت میں تراویح کے اعلیٰ درجہ کا ثبوت ہوتا ہے۔

ستائیسویں رات کو یہ جماعت عمومی تھی، جس میں عام لوگوں کے ساتھ آپ ﷺ کے اہل خانہ بھی شریک ہوئے۔ اس دور میں رکعتوں کی تعداد یہ تھی:

---

(۱) بخاری شریف فضل ليلة القدر باب العمل في العشر الأواخر من رمضان [٢٠٢٤] ٤/ ٢٦٩ ط: السلفيه؛ و مسلم كتاب الاعتكاف باب الاجتهاد في العشر الاواخر من رمضان [٧] ٢/ ٨٣٢ ط: الحلبی۔

۱۔ بہ روایت جابرؓ: چار رکعات۔

۲۔ بعض روایات میں آپ نے: آٹھ رکعات پڑھیں۔

۳۔ ایک ضعیف روایت میں ہے: بیس رکعات۔

۴۔ علی الاطلاق یعنی رکعت کی کوئی تحدید نہیں، اسی کے ساتھ رات کے بقیہ حصہ میں مزید بڑھانے کے مطالبہ کی تقریر و تائید۔

۵۔ بہ تدریج تہائی رات، پھر نصف شب، پھر دو تہائی رات۔ لیکن کیا اس کے ساتھ تینوں راتوں میں، رکعت کی تعداد میں اضافہ کیا گیا تھا یا قرأت ہی لمبی ہوگئی تھی اور رکعتوں کی تعداد وہی تھی؟ پھر قرأت اور قیام کو کس حد تک طول کیا گیا تھا؟

نماز تراویح کا طریقہ:

حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ایک رات، رمضان میں نماز پڑھی، رکوع کیا اور رکوع میں بہ قدر قیام **سبحان ربی العظیم** کہتے رہے۔ پھر سجدہ کیا اور سجدہ میں بہ قدر قیام **سبحان اللّٰہ ربی الاعلی** کہتے رہے۔ پھر سجدہ سے اٹھ کر بیٹھے تو بہ قدر قیام **رب اغفر لی** کہتے رہے۔ پھر سجدہ کیا، اور سجدہ میں بہ قدر قیام **سبحان ربی الاعلی** کہتے رہے۔ آپ نے صرف چار رکعات پڑھی تھی کہ حضرت بلال صبح کی نماز کے لئے بلانے آ گئے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ نے صرف چار رکعتیں نہایت طویل پڑھیں اور یہ خاص رمضان کا واقعہ ہے۔ رہا عام دنوں میں حضور کا معمول تو اس کے بارے میں امام بخاری نے (کتاب التہجد باب [۱۰] حدیث [۱۱۳۷] ۲۰/۳) پر یہ باب قائم کیا ہے: ''حضور ﷺ کی نماز کا طریقہ، اور رات میں آپ کتنی نمازیں پڑھتے تھے؟'' اس باب کے تحت امام بخاری حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے: ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ رات کی نماز کیسے ہے؟ آپ نے فرمایا: ''دو دو رکعتیں پڑھو اور جب صبح کا اندیشہ ہونے لگے، تو ایک رکعت وتر پڑھ لو۔''

اس روایت سے نہایت وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے جب تک صبح ہونے کا اندیشہ نہ ہو دو دو رکعتیں پڑھے گا۔

امام بخاریؒ نے ہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ کی نماز تیرہ رکعت تھی۔یعنی رات میں۔(حوالہ بالا حدیث [۱۱۳۸]حضرت مسروق نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رات میں حضور ﷺ کی نماز کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا: فجر کی سنت کے علاوہ، سات، نو، گیارہ رکعتیں۔(حوالہ بالا حدیث[۱۱۳۹])

امام بخاری ہی نے یہ باب قائم کیا ہے:''رمضان وغیرہ میں حضور ﷺ کا قیام لیل''اور اس کے تحت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت نقل کی ہے:

''رسول اللہ ﷺ رمضان یا غیر رمضان میں گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔چار رکعت ایسی پڑھتے کہ ان کی خوبی اور طوالت کو مت پوچھو۔پھر چار رکعتیں ایسی بہتر اور لمبی پڑھتے کہ مت پوچھو، پھر تین رکعت پڑھتے۔

حضرت عائشہ نے کہا: میں نے عرض کیا: آپ سونے سے پہلے وتر پڑھ لیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا:''عائشہ! میری آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتا''۔

(بخاری: کتاب التہجد باب[۱۶] حدیث[۱۱۴۷]۳۳/۳)

حضرت عائشہ نے آپ ﷺ کی نماز کو نہایت اچھی اور طویل بتایا اور یہ کہ اس کی تعداد گیارہ رکعات تھی۔لیکن صحیح مسلم (کتاب صلاۃ المسافرین حدیث[۷۷۲]۵۳۶/۱) میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک رات انہوں نے حضور ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔آپ نے سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورہ نساء پڑھی، آیت تسبیح پر پہونچتے تو تسبیح کرتے، دعاء اور طلب کی آیت پر پہونچتے تو دعاء کرتے، اور پناہ مانگنے کی آیت پر پہونچتے تو پناہ مانگتے۔پھر قیام کے بہ قدر رکوع میں رہے پھر رکوع کے بہ قدر قیام میں رہے، پھر قیام کے بہ قدر سجدہ میں رہے۔

ابن حجرؒ نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد کہا:''یہ تقریبا دو گھنٹوں میں پورا ہوگا،

شاید آپ نے پوری رات نماز پڑھی‘‘۔(فتح الباری مع البخاری ۱۹/۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام اس قدر طویل ہوتا تھا کہ ایک رکعت میں دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ بخاری (**کتاب التہجد باب طول القیام فی صلاۃ اللیل** [۱۱۳۵] ۱۹/۳) میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے آپ ﷺ کے ساتھ ایک رات نماز پڑھی، آپ اتنی دیر تک کھڑے رہے کہ میرا ارادہ برا ہو گیا۔ ہم نے کہا کہ کیا ارادہ تھا؟ انہوں نے کہا: میں نے ارادہ کیا کہ حضور کو چھوڑ کر بیٹھ جاؤں۔

الحاصل تراویح عہد نبوی میں تھی، اس کا ثبوت اور مشروعیت خود حضور ﷺ سے ہے البتہ مرحلہ وار اس میں تبدیلی آتی گئی جو حسب ذیل ہے:

۱۔ابتداء اس کی ترغیب دی گئی، عزیمت کے ساتھ حکم نہ تھا۔

۲۔پھر فرضیتِ صوم کے ساتھ متصل ہو کر سنت و مندوب ہوئی۔

۳۔عملی طور پر اس کو ادا کیا گیا، لوگوں نے اسکو متفرق طور پر ادا کیا۔

۴۔آہستہ سے لوگ حضور ﷺ کی جائے نماز تک آ گئے اور آپ کے پیچھے اس کو ادا کیا، آپ کو اس کا احساس نہیں ہوا۔ اور آپ ﷺ کسی کو باطل پر برقرار نہیں رکھ سکتے۔

۵۔جو لوگ دوسروں کو گھر یا مسجد میں نماز پڑھاتے تھے، آپ نے ان کو برقرار رکھا۔

۶۔بذات خود آپ نے اہل خانہ کے ساتھ اس کو ادا کیا۔

۷۔بذات خود آپ نے اہل خانہ اور دوسرے لوگوں کو، چند متفرق راتوں کو نماز تراویح پڑھائی۔ رہی تعدادِ رکعات تو اس کے بارے میں یہ ہے:

ا۔ آپ نے چار رکعت پڑھی جو پوری رات میں ختم ہوئی۔

ب۔ آٹھ رکعت پڑھی۔

ج۔ گیارہ رکعت پڑھی لیکن ان کی خوبی اور طوالت کو نہ پوچھو!

د۔ دس رکعات پڑھی۔

بعض متاخرین صرف اسی کا ذکر کرتے ہیں، لیکن اس کا بھی ثبوت ہے:

۱۔علی الاطلاق، بلا کسی تحدید ذکر یہ آیا ہے:''جس نے ایمان کے ساتھ ثواب کی نیت سے، رمضان کا قیام کیا''۔

۲۔صحابہ نے عرض کیا: رات کے بقیہ حصہ میں نفل پڑھا دیں۔آپ ﷺ نے اس کی تقریر وتثبیت فرمائی (اس پر نکیر نہیں کی)۔

۳۔یہاں پر ایک اور مسئلہ ہے جس کو ہمارے علم میں کسی نے نہیں چھیڑا، وہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: حضور ﷺ جب بھی عشاء پڑھ کر میرے گھر آتے، چار یا چھ رکعات پڑھتے۔اور حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ہے کہ آپ ﷺ رات کی نماز دو ہلکی رکعتوں سے شروع فرماتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ کی تیرہ رکعات، حضرت عائشہ کی، بعد عشاء چھ رکعات اور ابتدائی دو رکعت، ان سب کو اگر جمع کیا جائے (۱۳+۶+۲=۲۱) تو مجموعہ ۲۱/رکعات ہوگا۔اور یہی وہ تعداد رکعات ہے جس پر حضرت عمرؓ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی امامت میں جمع کیا تھا۔لہذا اس تعداد کا ثبوت سنت نبوی سے ہو جاتا ہے۔محض حضرت عمرؓ کا ذاتی اختیار وانتخاب نہیں، واللہ اعلم۔

اب کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مسروق عن عائشہ کی روایت پر اکتفاء کرتے ہوئے آٹھ سے زیادہ کو ممنوع قرار دے یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سنت کی مخالفت کرنے کا الزام دے، حاشاو کلا۔

☆☆☆☆☆

عہدِ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

حضرت ابوبکرؓ کا عہد مختصر رہا ہے، لوگ عہدِ رسالت سے قریب تھے، اس لیے تراویح میں کسی تبدیلی کے محرکات نہیں ملتے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نے عہد صدیقی میں تراویح کے تعلق سے کسی تبدیلی کا ذکر نہیں کیا، کیوں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہم کو رمضان کے قیام کی ترغیب دیتے تھے لیکن عزیمت کے ساتھ حکم نہیں تھا۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''جس نے ایمان کے ساتھ، ثواب کی نیت سے، رمضان کا قیام کیا اس کے پچھلے گناہ معاف ہوگئے''۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ امام بیہقیؒ (السنن ۴۹۲/۲) نے کہا: احمد بن منصور رمادی کی روایت میں یہ اضافہ ہے: ''حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے دور میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دور میں''۔ اس روایت کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔ اور اس کو امام مالکؒ نے ابن شہاب تک اپنی سند سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے وقت یہی سلسلہ جاری تھا اور یہی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے ابتدائی دور میں باقی رہا۔

بیہقیؒ (۴۹۵/۲) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول مذکور ہے کہ ہم مکتب سے بچوں کو پکڑ لاتے تاکہ ہمیں ماہ رمضان میں، قیام لیل کرائیں۔ اور اس کے عوض ہم ان کیلئے ''قلیہ'' (شوربہ) اور ''خشکنانج'' (آخروٹ اور بادام کی میٹھی روٹی) تیار کرتے تھے۔ مروزی کے الفاظ یہ ہیں: ہم ان کے لیے قلیہ اور ''خشکار'' تیار کرتے تھے۔ ''خشکار'' گیہوں کی روٹی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کی امامت میں تراویح ہوتی تھی۔ اور یہ عہد رسالت میں نہیں ہوا۔ لہذا یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں ہوا جو ایک تبدیلی مانی جائے

گی۔یا عہد فاروقی میں ہوا۔ بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہد صدیقی میں پیش آیا کہ؛ کیوں کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں مردوں کے لئے چند ائمہ اور عورتوں کیلئے ایک امام کی تعیین کا واقعہ پیش آیا ہے۔جیسا کہ آئے گا۔ بہر کیف یہ تبدیلی کا عکاس ہے۔اگر یہ واقعہ حضرت عمرؓ کے دور میں پیش آیا ہے تو غالب گمان ہے کہ ایسا گھروں کے اندر ہوا ہوگا،اس لئے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عورتوں کے لیے امام مقرر کر دیا تو پھر عورتیں مکتب سے بچوں کو پکڑ کر لائیں؟ایسا نہیں ہوسکتا۔خصوصاً حضرت عائشہؓ سے ایسی امید نہیں۔وہ تو اپنے گھر میں تراویح پڑھتی ہی ہوں گی اور کچھ عورتیں جمع ہو جاتی رہی ہوں گی۔

عہد صدیقی میں قرأت:

عہد صدیقی میں بھی قرأت لمبی ہوتی ہے۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن ابوبکر سے امام مالک (موطاص:۴۱) کی روایت میں ہے: میں نے اپنے والد کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہم رمضان میں قیام لیل (تراویح) سے لوٹتے تو جلدی جلدی خدام سے کھانا مانگتے کہ کہیں فجر طلوع نہ ہو جائے۔

عہد صدیقی میں،قرأت کے درمیان ایک طرح کا موازنہ شروع ہو گیا تھا،جس قاری کی آواز اچھی ہوتی لوگ اس کی طرف مائل ہوتے تھے،اس کی وضاحت **ان شاء اللہ** عہد فاروقی پر بحث کے ضمن میں آئے گی۔

عہد عمر فاروق رضی اللہ عنہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو یہی سابقہ نوعیت جاری تھی لوگ متفرق طور پر اکیلے اور باجماعت ،مسجد اور گھروں میں تراویح پڑھتے تھے۔اس کی مکمل تصویر ان دو آثار سے سامنے آتی ہے:ایاس ہذلی کا اثر اور عبدالرحمان بن عبد کا اثر۔

اثر اول:

بروایت نوفل،ایاس ہذلی نے کہا: لوگ رمضان میں،مسجد میں قیام لیل کرتے تھے۔

اگر کسی اچھی قراءت والے کو سنتے تو اس کی طرف مائل ہو جاتے۔ حضرت عمر نے فرمایا: لوگوں نے قرآن کو غناء بنالیا ہے، خدا کی قسم! اگر مجھ سے ہو سکا تو میں اس کو بدل کر رہوں گا۔ اس کے بعد تین راتیں نہیں گذری تھیں کہ انہوں نے سب لوگوں کو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پیچھے جمع کر دیا اور فرمایا: اگر یہ بدعت (نئی چیز) ہے تو کیا خوب بدعت ہے!! (رواہ المروزی)

اثر دوم:

عبدالرحمان بن عبد قاری کا اثر یہ ہے: میں حضرت عمر کے ساتھ رمضان میں مسجد میں آیا تو ہم کیا دیکھتے ہیں کہ لوگ متفرق طور پر، نماز پڑھ رہے ہیں، کوئی اکیلا پڑھ رہا ہے، تو کسی کے ساتھ ایک جماعت پڑھ رہی ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا: میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں ان سب کو کسی ایک قاری (امام) کے پیچھے جمع کر دوں تو بہتر ہوگا۔ اور پھر اس کا عزم کر کے انہوں نے سب کو حضرت ابی بن کعب کے پیچھے جمع کر دیا۔ اس کے بعد میں ان کے ساتھ ایک دوسری رات کو نکلا، لوگ اپنے قاری کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے تو حضرت عمر نے فرمایا: یہ بدعت تو اچھی ہوئی، رات کا وہ حصہ جس میں تم سوتے رہتے ہو (یعنی اخیر رات) اس حصہ سے افضل ہے جس میں نماز پڑھتے ہو۔ لوگ شروع رات میں ہی تراویح پڑھ لیتے تھے۔ (رواہ البخاری فی کتاب التراویح فصل من قام فی رمضان [۲۰۱۰] ۲۵۰/۴)

ایک تبدیلی:

ان دونوں آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر ایک تبدیلی ہوئی، یعنی انہوں نے متفرق لوگوں کو ایک قاری کے پیچھے جمع کر دیا۔ اس تبدیلی کے اسباب متعدد ہوں لیکن اس میں کئی مصلحتیں تھیں۔

پہلے اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سبب حسن قرأت تھا، جو قرأت کیلئے منافسہ اور مقابلہ کیلئے اور عام لوگوں کے لیے سبقت کا ایک بڑا میدان تھا۔ اگر یہی سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری رہتا تو نمازیوں کے مابین دوری پیدا ہو جاتی، لہذا انہوں نے قرأت کو متحد کرنے

کے لئے ایک قاری مقرر کر دیا۔اس سے یہ ضابطہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کسی مفسدہ کو دور کرنا، مصلحت کی تحصیل پر مقدم ہے؛ اس لیے کہ اگر نمازی سب سے اچھی آواز والے کو تلاش کرنے لگیں تو اس سے تحسین صوت کی راہ ہموار ہوگی۔تحسین صوت بذات خود مرغوب ہے لیکن یہ چیز غناء کی حد تک غلو کرنے کا سبب بن سکتی ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ اس کی طرف اشارہ کر چکے تھے۔لہذا اس کے سد باب اور دفع فساد کے مقصد سے سب کو ایک قاری کے پیچھے جمع کر دیا۔

دوسرے اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اکیلے اور باجماعت نماز تراویح پڑھتے تھے، آپس میں کوئی ربط نہ تھا۔اگر کچھ دنوں تک یہی سلسلہ جاری رہتا تو اتحاد واتفاق کے اسباب کا فقدان ہو جاتا اور اجتماعیت کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا، لہذا انہوں نے الگ الگ اماموں کو ختم کر کے، تمام لوگوں کو ایک امام کے پیچھے جمع کر دیا۔جس کی وجہ سے مقتدیوں میں بھی اتحاد پیدا ہو گیا۔اور ان دونوں لحاظ سے یہ ''اچھی بدعت'' ثابت ہوئی۔اور اب ایک امام (حضرت ابی بن کعبؓ) کے پیچھے تمام لوگ تراویح پڑھنے لگے۔

تعدد ائمہ:

روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مردوں کے لیے دو امام مقرر کیے تھے: حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت تمیم داری۔(موطا امام مالک ص:۴۰) یہ دونوں حضرات باری باری تراویح پڑھاتے تھے، پہلا امام جہاں پہنچ کر ٹھہرا ہوتا دوسرا وہیں سے شروع کرتا۔ سائب بن یزید کہتے ہیں: حضرت عمر بن خطابؓ نے، ابی بن کعبؓ اور تمیم داری کو حکم دیا کہ گیارہ رکعات پڑھائیں۔(موطا امام مالک ص:۴۰)

اسی کے ساتھ ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں طویل قرأت کی پابندی کی جاتی تھی۔حضرت سائب بن یزید کہتے ہیں: ہم لوگ حضرت عمر کے دور میں تیرہ رکعات پڑھتے تھے لیکن بخدا! صبح ہوتے ہوتے مسجد سے نکلتے، قاری صاحب ہر رکعت میں

پچاس یا ساٹھ آیات پڑھتے تھے۔

حضرت سائب ہی کی روایت ہے کہ وہ ''مـــئیـــن'' پڑھتے تھے۔لوگ لاٹھیوں کے سہارے کھڑے رہتے تھے۔یہ حضرت عمر بن خطابؓ کے دور کا واقعہ ہے''۔

ان دو آثار میں نئی بات:

پہلے ایک امام ہوا کرتا تھا،اب متعدد ائمہ ہو گئے۔خواہ اس کا مقصد،نائب مقرر کر کے،امام کے لیے سہولت پیدا کرنا ہو یا مقتدیوں کی سہولت اور آرام مدنظر ہوتا کہ اس وقفہ میں نشاط پیدا ہو جائے،خصوصاً جب کہ ابھی حال تک لوگ انفرادی طور پر پڑھتے تھے اور متعدد ائمہ ہوا کرتے تھے۔

بلکہ حضرت عمر نے اس سے آگے بڑھ کر عورتوں کے لیے الگ امام مقرر کر دیا اور تراویح کے لیے کئی ایک ائمہ کا انتخاب کیا۔سلیمان بن ابوحثمہ عورتوں کے امام ہوتے تھے۔مروزی میں ہے کہ ہشام اپنے والد عروہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے دو قاری (امام) مقرر کیے:ابی بن کعب مردوں کو،اور سلیمان بن ابوحثمہ عورتوں کو نماز پڑھاتے تھے۔

اس اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت اُبی مردوں کو تراویح پڑھاتے تھے اسی وقت سلیمان بن ابوحثمہ عورتوں کو پڑھاتے تھے یعنی دونوں حضرات ایک ساتھ تراویح پڑھاتے تھے:حضرت ابی بن کعب مردوں کو اور سلیمان عورتوں کو۔نشاط،صبر،طول قیام اور کثرت قرأت کے لحاظ سے یہ تراویح کی سب سے اعلیٰ حد تھی۔اب اس کے بعد بہ تدریج سہل ہوتی گئی،متعدد ائمہ ہو گئے،قرأت میں تخفیف کر دی گئی اور رکعتوں کی تعداد بڑھ گئی۔ائمہ کی تعداد میں مزید اضافہ کا ثبوت عاصم کی روایت میں ہے کہ ابوعثمان رحمہ اللہ نے کہا:حضرت عمرؓ نے رمضان میں قاریوں کو جمع کیا،سب سے تیز پڑھنے والے کو تیس آیات،اوسط درجہ والے کو پچیس آیات اور سب سے آہستہ پڑھنے والے کو بیس آیات پڑھنے کا حکم دیا۔

اس اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد ائمہ مقرر تھے،جس میں خود امام کے لئے اور مقتدیوں کے لیے زیادہ راحت اور سہولت تھی۔اسی طرح قراءت میں تخفیف کر دی گئی،پہلے

ساٹھ آیات اور ''مئین'' پڑھا کرتے تھے اب زیادہ سے زیادہ تیس آیات مقرر کردی گئیں؛ بلکہ حضرت عمر کے ایک دوسرے اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کے حکم سے حضرت ابی تراویح کی امامت کرتے تھے۔ لوگ چوتھائی رات تک سوتے، چوتھائی رات تراویح پڑھتے اور بقیہ چوتھائی حصہ سحری اور دوسری ضروریات کے لیے خالی رکھتے تھے۔ حضرت ابی ہر رکعت میں پانچ چھ آیات پڑھتے، دودو کرکے آٹھ رکعات پڑھاتے، ہر دو رکعات پر سلام پھیرتے، اس کے بعد وضوء اور قضائے حاجت کے بقدر ترویحہ کرتے تھے۔ اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس حد تک تراویح کی کیفیت اور قرأت میں کس قدر تبدیلی ہوگئی تھی۔

رکعتوں کی تعداد حسب ذیل ہے:

۱۔ گزر چکا ہے کہ حضرت عمرؓ کے حکم سے حضرت ابی لوگوں کو آٹھ رکعات پڑھاتے تھے اور ''مئین'' پڑھتے تھے، اور لوگ صبح ہوتے ہوتے گھروں کو لوٹتے تھے۔

۲۔ گزر چکا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابیؓ اور تمیم کو حکم دیا کہ ۱۳/رکعات تراویح پڑھائیں۔ یہ آٹھ رکعات والی روایت کے تعلق سے ہے، جس میں تین رکعت وتر ہوتی تھی۔

محمد بن سیرین کی روایت میں ہے کہ معاذ ابوحلیمہ قاری لوگوں کو ۴۱/رکعات تراویح پڑھاتے تھے۔ معاذ ابوحلیمہ کے بارے میں ''التقریب'' (ص۳۴۰ ط: دارنشر الکتب الاسلامیہ، پاکستان) میں ہے: یہ معاذ بن حارث انصاری بخاری قاری ہیں، ان کو بھی حضرت عمرؓ نے تراویح کے لئے مقرر کیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ دوسرے آدمی ہیں۔ جن کی کنیت ابوالحارث تھی، صغار صحابہ میں سے تھے، واقعہ حرہ میں شہید ہوئے۔ واقعہ حرہ ۶۳ھ میں پیش آیا۔ اس تفصیلی تعداد کی تائید ابوزید کی روایت سے ہوتی ہے کہ ''توأمہ'' کے آزاد کردہ غلام صالح نے کہا: ''میں نے واقعہ حرہ سے پہلے لوگوں کو ۴۱ رکعات پڑھتے ہوئے پایا، جس میں پانچ وتر تھی۔ لہٰذا ۴۱/میں سے پانچ ساقط کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ تراویح صرف ۳۶/رکعات تھی پانچ وتر ہوتی تھی۔

صالح کے بارے میں ''التقریب'' (ص۱۵۰) میں ہے: صالح بن نبہان مدنی، توأمہ

(تاء پر فتحہ، واؤ پر ساکن، اس کے بعد ہمزہ مفتوحہ ہے) کے آزاد کردہ غلام، صدوق ہیں۔ اخیر میں اختلاط ہوگیا تھا۔

ابن عدی نے کہا: قدماء (مثلاً ابن ابوذئب اور ابن جریر) کی روایت میں کوئی حرج نہیں۔ یہ طبقہ چہارم سے ہیں۔ ۱۲۵ھ میں انتقال ہوا۔ یہاں پر صالح سے روایت کرنے والے قدماء میں سے ابن ابوذئب ہیں جیسا کہ قدماء کی مثال میں، ابن عدی نے ان کا ذکر کیا ہے۔ صالح کہتے ہیں کہ واقعہ حرہ سے پہلے میں نے لوگوں کو ۴۱ رکعات پڑھتے ہوئے پایا، جن میں پانچ رکعات وتر تھی۔ صالح کی یہ روایت، محمد بن سیرین کے اس قول کے موافق ہے کہ معاذ ابو حلیمہ قاری لوگوں کو ۴۱ رکعات پڑھاتے تھے۔ یعنی ۳۶ رکعات تراویح اور پانچ رکعات وتر۔

ا۔ لہذا حضرت عمر کے زمانہ میں تراویح ابتداءً وتر کے ساتھ ۱۳/ رکعات تھی۔

ب۔ پھر وتر کے ساتھ ۲۳ رکعات ہوگئی۔

ج۔ پھر ۳۶ رکعات تراویح، ۵ رکعات وتر، کل ۴۱ رکعات ہوگئی۔ لیکن یہ امر قابل لحاظ ہے کہ رکعتوں کی کثرت کے ساتھ، قرأت میں تخفیف اور اختصار ہوتا گیا اسلئے کہ:

اولاً آٹھ یا تیرہ رکعتیں تھیں۔ ''مـئیـن'' پڑھتے تھے اور صبح ہوتے ہوتے واپس آتے تھے۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا ہے کہ ۳۶ رکعات میں قرأت کی مقدار، آٹھ یا تیرہ رکعات کی قرأت کے برابر ہوگی۔ بلکہ عملی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ قاریوں کو جمع کیا تو تیز تر پڑھنے والے کو تیس آیات پڑھنے کا حکم دیا جب کہ پچاس ساٹھ آیتیں پڑھا کرتے تھے۔ لہذا حضرت عمرؓ کے دور میں تراویح کی رکعتوں کی تعداد کے بارے میں مختلف روایات میں کوئی تعارض نہیں جیسا کہ باجی نے موطا کی شرح (۲۰۸/۱) میں لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر کے دور میں رکعتوں کی تعداد کے بارے میں مختلف روایات ہیں: سائب بن یزید کی روایت میں گیارہ، یزید بن رومان کی روایت میں تیس اور حضرت ابن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام نافع کی روایت میں ہے کہ میں نے رمضان میں لوگوں کو ۳۹ رکعات پڑھتے

ہوئے پایا، جن میں تین وتر ہیں۔ لہذا ہوسکتا ہے کہ حضرت عمر نے آٹھ رکعتوں سے آغاز کیا ہو جیسا کہ حضرت عائشہ کی اس روایت سے آپ ﷺ کا معمول معلوم ہوتا ہے کہ رمضان اور غیر رمضان میں آٹھ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔

اسی کے ساتھ حضرت عمر نے لمبی قرأت کرنے کا حکم دیا ہو چنانچہ قاری ایک رکعت میں مئین پڑھتا تھا۔ لیکن جب لوگ اس طرح ادا نہ کر سکے تو ۲۳؍رکعات پڑھانے کا حکم دیا قیام میں تخفیف کردی اور رکعتوں میں اضافہ کر کے اس فضیلت کی تلافی کردی۔ اور قاری آٹھ یا بارہ رکعات میں سورہ بقرہ پڑھتا تھا۔ ایک قول ہے کہ تیس سے بیس آیتیں پڑھتا تھا۔ واقعہ حرہ تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ لیکن جب لوگوں کیلئے قیام بھاری پڑ گیا تو انہوں نے قرأت میں تخفیف اور رکعتوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔ پھر اس طرح ۳۶؍رکعات تراویح اور تین رکعت وتر ہوگئی، یہی سلسلہ چل پڑا۔ ۳۶ رکعات کی تعیین غالباً واقعہ حرہ سے پہلے ہوئی جیسا کہ محمد بن سیرین کی روایت میں ہے کہ معاذ ابوحلیمہ لوگوں کو ۴۱؍رکعات پڑھاتے تھے۔ ابوحلیمہ کا انتقال قطعی طور پر واقعہ حرہ میں ہوا ہے۔ ہمارے لئے قابل لحاظ امر یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں، بہ تدریج قرأت میں تخفیف اور رکعتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ رکعتیں کم تھیں تو قرأت زیادہ تھی۔ اور رکعات زیادہ تھیں تو قرأت کم تھی۔

''یہ اچھی بدعت ہے'' پر بحث:

عہد عمری سے عہد عثمانی کی طرف جانے سے قبل، بہتر معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو باجماعت ایک قاری کے پیچھے جمع کرنے کے بعد حضرت عمر کے اس قول: ''یہ اچھی بدعت ہے'' کی وضاحت کردی جائے کہ اس سے مراد کیا ہے؟ اچھی ہونا اور بدعت ہونا، دونوں کے درمیان موافقت کی کیا شکل ہے؟

اس کی تشریح کے لیے سب سے بہتر ہوگا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتاب ''اقتضاء الصراط المستقیم'' (ص ۲۷۵ ط: مطبعۃ الحکومۃ، مکہ مکرمہ) کی عبارت نقل کردی جائے۔ موصوف فرماتے ہیں:

نماز تراویح شریعت میں بدعت نہیں، بلکہ سنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے قول وعمل سے اس کا ثبوت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ نے تم پر رمضان کے روزے فرض کئے اور میں نے اس کے قیام کو مسنون کیا''۔ نماز تراویح جماعت سے پڑھنا بدعت نہیں، بلکہ سنت ہے، بلکہ خود آپ ﷺ نے باجماعت ابتداء رمضان میں دو یا تین راتوں کو اور عشرہ اخیرہ میں کئی بار باجماعت پڑھی اور فرمایا: ''اگر آدمی امام کے ساتھ نماز پڑھ کر لوٹے تو اس کے لیے رات بھر کے قیام کا ثواب لکھ دیا جاتا ہے''۔ اور آپ نے لوگوں کے ساتھ اتنی دیر تک قیام لیل فرمایا کہ سحری چھوٹنے کا اندیشہ ہونے لگا۔ (رواه أهل السنن)۔ اس حدیث سے امام احمد وغیرہ نے استدلال کیا ہے کہ باجماعت تراویح پڑھنا، اکیلے پڑھنے سے افضل ہے۔ ان کے اس قول میں، امام کے پیچھے تراویح پڑھنے کی ترغیب ہے۔ اور اس میں مطلق سنت سے زیادہ تاکید ہے۔ (۱) لوگ عہد نبوی میں، مسجد نبوی میں باجماعت تراویح پڑھتے تھے۔ آپ ﷺ ان کو برقرار رکھتے، اور آپ کا برقرار رکھنا سنت ہے۔ رہا حضرت عمر کا یہ قول کہ یہ اچھی بدعت ہے تو اس سے استدلال کرنے والے اکثر لوگ (اگر ہم حضرت عمر کے اس قول سے کوئی حکم ثابت کرنا چاہیں، جس میں ان کا کوئی مخالف نہیں) کہیں گے کہ صحابی کا قول حجت نہیں، لہذا رسول اللہ ﷺ کے قول کے خلاف، یہ ان کے لیے کس طرح حجت بنے گا؟ اور جو لوگ صحابی کے قول کو حجت مانتے ہیں وہ بھی، حدیث کے خلاف قول صحابی کو حجت نہیں مانتے۔

بہر دو صورت صحابی کے قول کو حدیث کے بالمقابل نہیں رکھا جاسکتا، ہاں حدیث کے عموم کی تخصیص، قول صحابی (جس کا کوئی مخالف نہ ہو) سے، ایک روایت کے مطابق ہوسکتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ قول ان کے لئے ''اس بدعت'' کے بہتر ہونے کا فائدہ دے سکتا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں۔ پھر ہم کہتے ہیں کہ اس میں زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ حضرت عمر نے اس کو بدعت کہا اور یہ لغوی اعتبار سے ہے، شرعی اعتبار سے نہیں، کیوں کہ لغوی اعتبار سے ''بدعت'' ہر ایسے کام کو کہا جاتا ہے جو ابتداء میں کیا جائے، پہلے سے اس

(۱) خط کشیدہ عبارت بہ ظاہر شیخ الاسلام کی مراد امام احمد کی مستدل حدیث ہے نہ کہ خود امام احمد کا قول۔

کی نظیر موجود نہ ہو۔ جب کہ شرعی اعتبار سے بدعت ہر اس فعل کو کہتے ہیں جس کی کوئی شرعی دلیل نہ ہو۔

اگر رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے، آپ کی موت کے بعد، کسی فعل کے استحباب یا وجوب کا علم ہو یا علی الاطلاق اس کا علم ہو اور آپ کی وفات کے بعد ہی اس پر عمل ہو سکا، جیسا کہ صدقات کے بارے میں آپ کا گرامی نامہ جس کو حضرت ابو بکر نے نکالا تھا، اگر کوئی آپ کی وفات کے بعد اس پر عمل کرے تو اس کو لغوی اعتبار سے بدعت کہہ سکتے ہیں، اسلئے کہ اس پر ابتداءً عمل ہوا ہے۔ جیسا کہ خود آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کو لغوی اعتبار سے ''بدعت'' اور ''محدث'' (نیا) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ حبشہ ہجرت کرنے والے صحابہ کے بارے میں قریش کے قاصدوں نے نجاشی کے دربار میں کہا تھا کہ یہ لوگ اپنے آبائی دین سے نکل گئے اور بادشاہ کے دین میں داخل نہیں ہوئے۔ یہ لوگ ''محدث'' (نیا) دین لائے ہیں، جس کو کوئی نہیں جانتا۔ پھر جس عمل کی کتاب وسنت میں دلیل ہو، اس کو شریعت میں بدعت نہیں کہتے، گو لغوی اعتبار سے بدعت کہتے ہوں۔ لغوی اعتبار سے لفظ بدعت، شرعی لحاظ سے لفظ بدعت سے عام ہے۔ معلوم ہو کہ آپ ﷺ کے قول: ''ہر بدعت گم راہی ہے'' سے مراد ہر ابتدائی نیا کام نہیں، کیونکہ دین اسلام بلکہ انبیاء کا لایا ہوا ہر دین ''نیا عمل'' ہے۔ حدیث سے مراد صرف وہ اعمال ہیں جن کو حضور ﷺ نے نہیں بتایا۔ اور جب ایسا ہے تو آپ ﷺ کے زمانہ میں لوگ باجماعت اور انفرادی طور پر تراویح پڑھتے تھے۔

جب تیسری یا چوتھی رات میں لوگ جمع ہوئے تو آپ نے ان سے یہی فرمایا تھا: ہاں میرے نہ نکلنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ یہ تمہارے ذمہ فرض ہو جائے۔ لہذا تم اپنے گھروں میں پڑھو، اسلئے کہ فرض نماز کے علاوہ، آدمی کی سب سے بہتر نماز وہ ہے جو گھر میں ہو''۔ آپ ﷺ نے نہ نکلنے کی وجہ اندیشہ فرضیت قرار دیا اور یہ اندیشہ آپ کی وفات کے بعد ختم ہو گیا۔ لہذا اس کا معارض باقی نہ رہا۔

اس کے بعد موصوف نے بہت سے دوسرے دلائل نقل کئے ہیں، مثلاً جمع قرآن،

حضرت عمر کے ہاتھوں خیبر کے یہودیوں کی جلاوطنی، اور حضرت ابوبکر کا زکوۃ روکنے والوں سے جنگ کرنا۔

اس کے بعد موصوف نے بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ کا ضابطہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے: اس سلسلہ میں ضابطہ (واللہ اعلم) یہ ہے کہ کہا جائے کہ لوگ کوئی چیز مصلحت سمجھ کر ہی ایجاد کرتے ہیں، کیونکہ اگر اس کو فاسد تصور کریں تو اس کو ایجاد نہ کریں، اسلئے کہ یہ نہ عقل کا تقاضا ہے نہ دین کا، لہذا جس میں مسلمان مصلحت سمجھیں اس پر غور کیا جائے گا یہ اور اس کا سبب اور داعیہ کیا ہے؟ اگر اس کا داعیہ اور سبب، حضور ﷺ کے بعد پیدا ہونے والا کوئی امر ہو تو اس صورت میں حسب حاجت ایجاد کا جواز ہے۔ (اس کے بعد موصوف نے ایک عبارت لکھی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ کا اس عمل کو ترک کرنا، کوتاہی کے سبب نہ تھا) اسی طرح اگر اس فعل کا داعیہ آپ ﷺ کے زمانہ میں رہا ہو لیکن کسی معارض کے سبب آپ ﷺ نے اس کو ترک فرمایا اور وہ معارض آپ کی وفات کے بعد زائل ہو گیا ہو۔

حضرت عمر کے قول (یہ اچھی بدعت ہے) کی تشریح میں، یہ موصوف کا حرف بہ حرف کلام ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو لوگ باجماعت تراویح اور حضرت عمر سے منقول ۲۱ رکعات کو بدعت کہتے ہیں، ان کی تردید کے لیے یہ بالکل واضح ہے۔ ہاں یہ بحث کہ یہ تعداد حضرت عمر سے ثابت ہے یا نہیں، تو اس کے لیے موطا امام مالک کی روایات کافی ہیں، واللہ اعلم۔

عہد عثمان وعلی رضی اللہ عنہما:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بذات خود حضرت علی رضی اللہ عنہ اکثر راتوں میں تراویح کی امامت کرتے تھے۔ سنن بیہقی (۴۹۸/۲) میں حضرت قتادہ، حضرت حسن کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت علی نے بیس راتوں کو تراویح کی امامت کی پھر اپنے گھر میں رک گئے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ وہ اپنی عبادت کے لیے فارغ ہو گئے ہیں، پھر ابو حلیمہ معاذ قاری نے امامت کی۔ وہ قنوت پڑھتے تھے۔

بہر کیف اس عہد میں حضرت علیؓ بیس راتوں کو تراویح کی امامت کرتے تھے اور عشرہ اخیرہ میں قنوت بھی پڑھا جاتا تھا، اور خود حضرت ابی بن کعب بھی رمضان کے اخیر عشرہ میں، قنوت پڑھتے تھے۔

اس دور میں رکعتوں کی تعداد، یا ان کی ادائیگی کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں ملتی۔ غالب گمان ہے کہ حضرت عمر کے دور کا معمول چل رہا تھا۔ جیسا کہ حضرت علی کے دور میں رکعتوں کی تعداد کے بارے میں آرہا ہے۔

دعاءختم قرآن:

ہاں حضرت عثمان کے دور میں ایک عمل ملتا ہے جو قریب قریب نیا تھا۔ یعنی دعاء ختم قرآن۔ ابن قدامہ المغنی (۲/۱۷۱، تحقیق الترکی) میں لکھتے ہیں: فصل ختم قرآن کے بیان میں۔ فضل بن زیاد نے کہا: میں نے ابوعبداللہ سے دریافت کیا: میں قرآن کو وتر میں ختم کروں یا تراویح میں؟ انہوں نے فرمایا: وتر میں کرو، تاکہ ہمیں دو دعائیں نصیب ہو جائیں۔ میں نے عرض کیا: اس کی شکل کیا ہے؟ فرمایا: جب تم قرآن ختم کرلو، تو رکوع میں جانے سے پہلے اپنے ہاتھوں کو اٹھاؤ اور یہ دعاء کرو، ہم لوگ نماز میں ہوں گے، دیر تک کھڑے رہو۔ میں نے عرض کیا: کیا دعاء پڑھوں؟ فرمایا کہ جو دعا چاہے کرو۔

فضل بن زیاد کہتے ہیں: میں نے ان کے حکم کے مطابق عمل کیا وہ میرے پیچھے کھڑے رہے، اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھائے دعاء کررہے تھے۔

حنبل نے کہا: میں نے امام احمد کو ختم قرآن کے بارے میں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم (قل اعوذ برب الناس) پڑھ لو تو رکوع سے پہلے اپنے ہاتھوں کو اٹھا کر دعاء کرو۔ میں نے عرض کیا: اس کا کیا ثبوت ہے؟ انہوں نے فرمایا: میں نے اہل مکہ کو یہی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ سفیان بن عیینہ مکہ میں لوگوں کو اسی طرح دعاء کراتے تھے۔ عباس بن عبدالعظیم نے کہا: ہم نے بصرہ اور مکہ میں لوگوں کو اسی طرح کرتے ہوئے پایا۔ اہل مدینہ اس کے بارے میں کچھ نقل کرتے ہیں، اور یہی حضرت عثمان بن عفان سے نقل کیا گیا ہے۔

خط کشیدہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ، بصرہ اور مدینہ منورہ؛ ان تینوں شہروں کا عام معمول یہی تھا۔ نیز یہ حضرت عثمان سے پہلے موجود نہ تھا۔ حضرت عثمان ہی سے اس کا آغاز ہوا ہے، اگر ان کا یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ حضرت عثمان سے نقل کیا گیا ہے۔

بہر حال امام احمد نے ان تینوں شہروں کے عمل سے استدلال کرتے ہوئے اور اہل مدینہ کے یہاں حضرت عثمان سے منقول روایت سے مطمئن ہو کر اس پر عمل کیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل جو طول قیام کے ساتھ، دعاء ختم قرآن کا معمول ہے وہ مدینہ منورہ میں موجود تھا۔ اس کی تصریح امام احمد کے مسلک کے بیان کے ضمن میں آئے گی ان شاء اللہ۔

عباس بن عبدالعظیم:

عباس بن عبدالعظیم (جن سے مذکورہ بالا قول منسوب ہے) کے حالات کا ذکر تہذیب التہذیب (۱۴۰/۲ ط: موسسۃ التاریخ العربی) میں کچھ اس طرح ہے:

''عباس بن عبدالعظیم بن اسماعیل بن توبہ عنبری، ابوالفضل، بصری حافظ ہیں''۔

مصنف نے ان کے تقریباً بیس مشائخ شمار کرنے کے بعد فرمایا: ''ان کی روایت'' جماعت'' کے یہاں ہے۔ لیکن بخاری میں تعلیقاً ہے''۔ پھر ان کے دس تلامذہ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: وغیرہم۔

پھر کہا (مصنف نے): ابو حاتم نے کہا: صدوق ہیں ۔نسائی نے کہا: مامون ہیں۔ پھر دوسرے علماء کے ان کے متعلق تعریفی کلمات ذکر کیے ہیں۔ اور اخیر میں کہا: بقول بخاری و نسائی ۲۴۶ھ میں وفات پائی۔

پھر کہا: میں (یعنی صاحب التہذیب) نے کہا: اور مسلمہ نے کہا: بصری ثقہ ہیں۔ التقریب (ص ۱۶۵) میں ان کے متعلق ہے: عباس بن عبدالعظیم بن اسماعیل عنبری، ابوالفضل، بصری، ثقہ، حافظ گیارہویں طبقہ کے بڑے علماء میں سے ہیں ۲۴۰ھ میں وفات پائی۔ (خت، م، عم)

''خت'' سے مراد بخاری میں تعلیقاً۔ ''م'' سے مراد امام مسلم اور ''عم'' سے مراد شیخین

کے علاوہ ''جماعت'' ہے۔ بہر کیف اس سے واضح ہوتا ہے کہ اہل مدینہ سے ان کی نقل، ثقہ حافظ کی نقل ہے۔ واللہ اعلم

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے دور میں تراویح سے متعلق نئی چیز، خود حضرت علی کا بیس راتوں کو تراویح کا امام ہونا اور دعاء ختم قرآن کا ہونا ہے۔

عہدِ حضرت علی رضی للہ عنہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور کے متعلق سنن بیہقی (۲۹۶/۲) میں ہے کہ انہوں نے مردوں کے لیے ایک امام اور عورتوں کے لئے ایک امام مقرر کیا، ہاں وتر میں وہ خود امامت کرتے تھے۔ عطاء بن سائب، ابو عبدالرحمٰن سلمی سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رمضان میں، قاریوں کو جمع کیا اور ایک قاری کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعات تراویح پڑھائے اور وتر میں وہ خود امامت کرتے تھے۔ امام بیہقی نے کہا: یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دوسرے طریق سے بھی مروی ہے۔ اس روایت سے ایک نئی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عثمان کے دور میں، خود حضرت علی تراویح کی امامت کرتے تھے اور عشرہ اخیرہ میں صرف اپنے لیے تراویح پڑھتے تھے، امامت نہیں کرتے تھے۔ لیکن اپنے دور میں، صرف وتر میں امامت کرتے تھے۔

حضرت علی کے دور میں عورتوں کے امام، عرفجہ ثقفی ہوا کرتے تھے جیسا کہ مروزی میں ہے: عرفجہ ثقفی کہتے ہیں کہ میں حضرت علی کے دور میں عورتوں کا امام تھا۔

حضرت علی کے دور میں تراویح بیس رکعت اور وتر تین رکعت تھی، اغلب ظن یہی ہے۔ جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور اس سے قبل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں تھا، اور ۳۶ رکعت کی جس زیادتی کا ذکر آچکا ہے، وہ حضرت علی ہی کے دور میں ہوئی۔

حضرت علیؓ نے اپنے دور میں خود وتر میں امامت کی، جب کہ حضرت عمر و عثمانؓ کے دور میں ایسا نہ تھا۔

حضرت عمر و عثمان اور علی رضی اللہ عنہم سے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دوران:

اب تک غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے دور میں تراویح کی تعداد رکعات ۲۳ رہی ہے، جس میں تین رکعت وتر تھی، جیسا کہ موطا مالک میں یزید بن رومان کی روایت ہے کہ لوگ عمر بن خطابؓ کے دور میں ۲۳ رکعت تراویح پڑھتے تھے۔ یزید کے بارے میں التقریب میں ہے: یزید بن رومان مدنی، آل زبیر کے آزاد کردہ غلام، ثقہ، پانچویں طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۳۰ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ اس سے ان کی مراد صرف حضرت عمر کا دور ہے ورنہ کہتے کہ ''اور عثمان و علی''۔

لہذا معاذ قاری اور صالح مولی التوأمہ کی روایات میں جس اضافہ کا ذکر ہے وہ حضرت عمر، عثمان اور علی کے بعد ہوا ہے؛ اس لئے کہ اس کے بارے میں تحدید کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ حرہ سے قبل ہوا، ہاں واقعہ حرہ سے قبل کب ہوا، اس کی تعیین نہیں۔

جب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کے دور میں ۲۳/رکعت تھی اور حضرت علی کے اپنے دور میں ۲۳/رکعت ہی کی تصریح ملتی ہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت علی کے دور تک ۲۳/رکعت ہی برقرار رہی ہے، اس میں اضافہ حضرت علی کے بعد ہی ہوا ہے جو حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور اور اس کے بعد قائم رہا۔

حضرت علی کے دور میں ہونے والے اضافہ کی تحدید و تعیین:

اولاً جیسا کہ گزرا ''باجی'' کے یہاں، نافع مولیٰ ابن عمر کی روایت ہے۔ نافع کہتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو ۳۹ رکعت پڑھتے ہوئے پایا، جس میں ۳ رکعت وتر تھی۔ یعنی وتر کو چھوڑ کر تراویح ۲۰ رکعت سے ۳۶ رکعت ہوگئی۔ نافع کا انتقال ۱۱۷ھ میں ہوا یعنی عمر بن عبد العزیز کے انتقال کے صرف چھ سال بعد، اسلئے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کا انتقال ۱۰۱ھ میں ہوا۔ نافع کے قول: ''میں نے لوگوں کو پایا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معمول خلافت عمر بن عبد العزیز سے پہلے سے چلا آ رہا تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور میں اس تعداد کی تصریح، ابان بن عثمان نے بھی کی ہے۔ مروزی میں داؤد بن قیس کا قول ہے کہ ابان بن

عثمان اور عمرؒ بن عبدالعزیز کے دور میں مَیں نے لوگوں کو مدینہ میں ۳۶ رکعت تراویح اور ۳ رکعت وتر پڑھتے ہوئے پایا۔اور بعض روایات میں ہے: ۵ رکعت وتر۔

داؤد بن قیس کی روایت اور نافع کی دو میں سے ایک روایت کے پیش نظر واضح ہے کہ یہ اضافہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز سے پہلے ہوا، اس لئے کہ اس میں ہے کہ وہ ۴۱ رکعت پڑھتے تھے۔

نافع کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۶ رکعت تراویح اور ۵ رکعت وتر پڑھتے تھے۔جس کا مجموعہ ۴۱ رکعت ہے۔بہر کیف نافع ،داؤد ،اور صالح مولی التوأمہ؛ ہر ایک کی روایت ۴۱ رکعت کے وجود پر متفق ہے۔جس میں سے ۵ رکعت وتر تھی۔اور یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور سے قبل ہوا، اور انہوں نے اس کو برقرار رکھا۔اس کے بعد اسی تعداد کا معمول رہا۔جیسا کہ وہب بن کیسان کی روایت آگے آرہی ہے۔

امام شافعی نے کتاب الام (مختصر المزنی ۴۲/۸ اط: دار الفکر بیروت) میں فرمایا: اور میں نے لوگوں کو، مدینہ میں ۳۹ رکعت پڑھتے ہوئے دیکھا۔میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ۲۰ رکعت ہے، اس لئے کہ یہی حضرت عمرؓ سے مروی ہے۔اسی طرح اہل مکہ تراویح پڑھتے ہیں، اور تین رکعت وتر پڑھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

عہد ائمہ اربعہ رحمھم اللّٰہ

اولاً: امام دار الہجرت امام مالک کا عہد

امام مالک نے، حضرت عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ ۸؍سال پایا ہے، کیوں کہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کا انتقال ۱۰۱ھ میں ہوا، اور امام مالک ۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ اس طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے وقت امام مالک ۸؍سال کے تھے یعنی ان کی طالب علمی کا زمانہ تھا۔ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک کے دور میں، تراویح کی رکعتوں کی تعداد ۳۶ رکعت تھی؛ بلکہ یہی تعداد اس وقت بھی تھی جب ان کی عمر ۳۴ سال تھی۔ جیسا کہ وہب بن کیسان کی رویت ہیکہ لوگ آج تک، رمضان میں ۳۶ رکعت تراویح اور تین رکعت وتر پڑھتے رہے ہیں۔ وہب کا انتقال ۱۲۷ھ میں ہوا ہے۔

امام مالکؒ نے اس سے واضح طور پر وضاحت کی ہے، جیسا کہ مروزی میں ابن ایمن کی روایت ہے کہ امام مالک نے کہا: میرے یہاں پسندیدہ یہ ہے کہ لوگ ۳۸ رکعت تراویح پڑھیں۔ پھر امام، نمازیوں کو سلام پھیر کر ایک رکعت وتر پڑھائے۔ مدینہ میں یہ معمول حرہ سے قبل، سو سال سے کچھ پہلے سے ہے۔

امام مالکؒ کے اس قول: ''مدینہ میں یہ معمول، حرہ سے قبل، سو سال سے کچھ پہلے سے ہے'' سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ۳۹ رکعت مع وتر، حضرت عمر بن عبدالعزیز سے پہلے سے ہے۔ اسی کو عمر بن عبدالعزیز نے برقرار رکھا اور امام مالک نے اسی کو پسند کیا۔

اسی وجہ سے امام مالکؒ اس تعداد میں کمی کو ناپسند کرتے تھے۔ ابن قاسم نے کہا: میں نے امام مالکؒ کو یہ تذکرہ کرتے ہوئے سنا کہ جعفر بن سلیمان نے ان کے پاس یہ

دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ تراویح میں کچھ کمی کر دی جائے؟ تو انہوں نے منع کر دیا۔ ان (ابن قاسم) سے پوچھا گیا کہ کیا انہوں (امام مالک) نے اس کو ناپسند کیا؟ تو انہوں نے کہا کہ ہاں۔

قدیم زمانے سے لوگ یہی تراویح پڑھتے آئے تھے۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ تراویح کتنی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: وتر کے ساتھ ۳۹ رکعت۔ امام مالک کا مسلک تفصیل سے دوسرے مذاہب کے تذکرہ کے ساتھ ان شاء اللہ آگے آئے گا۔ یہاں صرف امام مالک کے دور میں، مسجد نبوی میں تراویح کا ذکر مقصود تھا۔

امام شافعیؒ نے امام مالک کا زمانہ پایا ہے اور ان سے علم حاصل کیا۔ مدینہ منورہ کے متعلق، امام شافعی کے یہاں بھی اسی تعداد کا ذکر ملتا ہے۔ زعفرانی نے کہا کہ امام شافعی نے فرمایا: میں نے لوگوں کو مدینہ میں ۳۶ رکعت تراویح پڑھتے ہوئے پایا۔ لیکن خود امام شافعیؒ کا مسلک کیا ہے؟ اس کی طرف انہوں نے اس کے معاً بعد یہ کہہ کر اشارہ کر دیا کہ میرے نزدیک بیس رکعت زیادہ پسندیدہ ہے۔ اہل مکہ بیس رکعت ہی پڑھتے ہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: ''اس میں کوئی تنگی نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی حد ہے، کیوں کہ یہ نفل ہے۔ اگر قیام لمبا کر کے سجود (رکعتوں) کو کم کر دیں، تو بہتر ہے، اور یہی میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور اگر رکعتوں کو بڑھا دیں تو بھی اچھا ہے''۔

مذاہب اربعہ کے تذکرہ میں، ان کے مسلک کا ذکر آئے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ تعداد رکعات کے تعلق سے تو کوئی نئی چیز پیش نہیں آئی، البتہ دوسرے لحاظ سے کچھ نئی چیزیں پیش آئیں ہیں مثلاً:

قرأت کی مقدار:

ہر رکعت میں دس آیات ہوا کرتی تھیں، جیسا کہ مروزی میں عبدالرحمٰن بن قاسم کی روایت ہے کہ امام مالک سے تراویح کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ قاری کتنی آیتیں پڑھے؟ فرمایا: دس دس آیتیں، البتہ اگر ہلکی سورتیں ہوں تو بڑھا دے مثلاً صافات اور

طسم ۔دریافت کیا گیا کہ پانچ آیتیں؟ فرمایا کہ نہیں، بلکہ دس آیتیں ۔اور **المدونۃ الکبریٰ** (۱/۲۲۳ط، دارالفکر، بیروت) میں ابن وہب نے تصریح کی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے قاریوں کو حکم دیا کہ چھتیس رکعت تراویح اور تین رکعت وتر پڑھا کریں اور ہر رکعت میں دس آیتیں پڑھیں۔

دوسری طرف خود انہی کے دور میں کچھ لوگ ایک رات میں پورا قرآن پڑھتے تھے۔امام مالکؒ نے کہا کہ عمر بن حسین فقیہ، با کمال اور عبادت گزار تھے۔ایک شخص نے مجھے بتایا کہ اس نے ان کو رمضان میں ہر روز قرآن شریف شروع کرتے ہوئے سنا ہے۔پوچھا گیا کہ کیا وہ قرآن ختم کرلیا کرتے تھے؟ فرمایا کہ ہاں۔اور وہ رمضان میں عشاء پڑھ کر لوٹ جاتے تھے جب تیئیس کی رات آتی تو عام لوگوں کے ساتھ تراویح پڑھتے تھے، بقیہ راتوں میں ان کے ساتھ تراویح نہیں پڑھتے تھے۔پوچھا گیا کہ ابوعبداللہ! ایک شخص ہر رات قرآن ختم کرتا ہے؟ فرمایا کہ یہ تو بہت اچھا ہے، کیوں کہ قرآن ہر بھلائی کا امام ہے یا فرمایا کہ ہر بھلائی کے آگے ہے۔

طریقۂ قرأت:

ان کے زمانہ میں خاص طریقہ پر قرأت شروع ہوتی تھی یعنی بسم اللہ اور **اعوذ باللہ** بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ابن وہب نے کہا کہ میں نے امام مالکؒ سے پوچھا کہ کیا نفل نماز میں اعوذ باللہ پڑھے گا؟ فرمایا: ہاں، رمضان میں ہر سورہ سے پہلے **اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم** پڑھے گا۔میں نے عرض کیا باآواز بلند پڑھے گا؟ فرمایا: ہاں۔میں نے عرض کیا کہ تراویح میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً پڑھے گا؟ فرمایا: ہاں۔ابن وہب کہتے ہیں کہ امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ اللہ اکبر کہنے کے بعد، قرأت شروع کرنے سے قبل، **اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم** پڑھے گا؟ فرمایا کہ میرے علم کے مطابق یہ صرف رمضان میں ہے۔ہمارے قاری حضرات اسی طرح پڑھتے ہیں اور یہ قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔

امام مالکؒ کے قول ''اور یہ قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے'' کی تائید ابوالزناد کے

اس قول سے ہوتی ہے کہ میں نے قاری حضرات کو پایا ہے کہ وہ رمضان میں قرأت شروع کرنے سے قبل، أعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم پڑھتے ہیں۔

مروزی نے کہا کہ ان کا تاحیات یہ معمول رہا ہے کہ رمضان میں تراویح میں اعوذ باللہ پڑھتے تھے، کبھی اس کو ترک نہیں کیا۔ ابولزناد کا انتقال ۱۳۰ھ میں ہوا ہے یعنی عمر بن عبد العزیز کے انتقال کے بعد اور امام مالک کے انتقال سے قبل۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے مقرر کردہ قراء، رمضان میں أعـــوذ بـــاللہ نہیں چھوڑتے تھے۔ غالبًا ابوالزناد کے قول: ''میں نے قاری حضرات کو پایا'' سے مراد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے قاری ہیں؛ اس لئے کہ ان کی اور عمر بن عبد العزیز کی وفات کے درمیان صرف ۲۹ سال ہیں۔

ابوالزناد کے بعد، سعید بن ایاس کے دور تک یہی معمول رہا۔ سعید کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ جب اہل مدینہ، رمضان میں، سورہ فاتحہ اور ولا الـضـــالیـن پڑھ کر رمضان میں فارغ ہوتے ہیں تو ''ربنا انا نعوذ بك من الشیطان الرجیم'' پڑھتے ہیں۔

اس مسئلہ کا حکم امام مالک کے نزدیک (جیسا کہ باجی نے شرح موطا میں لکھا ہے) یہ ہے: (مسئلہ) المدونہ میں امام مالک سے، ابن القاسم کی روایت کے مطابق، قاری کے لیے استعاذہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن ''العتبیہ'' میں اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ استعاذہ ترک کرنا میرے نزدیک زیادہ پسند ہے۔ باجی نے دونوں روایتوں کی توجیہ کی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بسملہ (جیسا کہ کہا گیا ہے) وہ حرف ہے یعنی سات قرأتوں میں سے ایک قرأت اس کے اثبات کی، اور دوسری روایت اس کے اسقاط کی ہے۔ یہ دونوں روایتیں نافع سے ہیں۔ ورش کی روایت ترک بسملہ کی ہے۔ اور ان سے قالون کی روایت اثبات کی ہے۔ قرأت کے بارے میں یہ شعر اسی کے مطابق ہے۔

قالون بین السورتین بسملا ورش عنہ الوجہان نقلا

(قالون دونوں سورتوں کے درمیان بسملہ کے قائل ہیں، جب کہ ورش سے دونوں وجوہات منقول ہیں)

نافع، مدینہ کے قاری ہیں، امام مالکؒ نے انہی سے پڑھا ہے اور انہوں نے اس مسئلہ میں قالون کی قرأت اور ورش سے اثبات بسملہ والی روایت کو ترجیح دیا ہے۔

رمضان کی پہلی رات میں قرأت کا آغاز کہاں سے ہوگا؟ اس کے بارے میں مروزی نے کہا: ابوحازم کہتے ہیں کہ رمضان شروع ہوتا، تو پہلی رات میں، اہل مدینہ ''انا فتحنالك فتحاً مبيناً'' سے شروع کرتے تھے۔

اہل مدینہ کی تراویح اور اہل مکہ کی تراویح کے مابین موازنہ:

امام مالک کا قول گزر چکا ہے کہ وہ ۳۸ رکعت تراویح اور ایک رکعت وتر کل ۳۹ رکعات مستحب سمجھتے ہیں۔ اسی طرح امام شافعی کا کلام آچکا ہے کہ انہوں نے اہل مدینہ کو ۳۹ رکعت پڑھتے ہوئے پایا۔ اس سے امام مالک اور امام شافعی کے زمانہ میں، تراویح کا معمول کیا تھا معلوم ہوتا ہے۔

تاہم امام شافعی کہہ چکے ہیں کہ میرے نزدیک ۲۰ رکعت زیادہ پسندیدہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ اہل مکہ اتنی ہی پڑھتے ہیں۔ نیز انھوں نے کہا کہ یہ نفل ہے، جس کی کوئی آخری حد نہیں ہے۔

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ اہل مدینہ ۳۹ رکعت پڑھتے تھے، جس کو امام مالک نے مستحب قرار دیا، جب کہ اہل مکہ بیس رکعت پڑھتے تھے اور اسی کو امام شافعیؒ نے اپنے نزدیک احب اور پسندیدہ قرار دیا ہے؟

رہا امام شافعی کا یہ کہنا کہ بیس رکعت میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے اور یہی اہل مکہ کا عمل ہے، تو **واللہ اعلم**، ظاہر یہ ہے کہ یہی اصل ہے۔ یعنی خلفاء ثلاثہ (حضرت عمر، عثمان اور علیؓ) کے دور میں اسی پر عمل تھا اور صحابہ کا اسی پر اجماع تھا کہ مسجد میں بیس رکعت پڑھیں خود حضرت علی نے اتنی ہی رکعات پڑھی یعنی قاری کو حکم دیتے تھے کہ بیس رکعت پڑھائے اور پھر خود وتر پڑھاتے تھے۔۔

ابوزرعہ نے **طرح التثریب** (۹۸/۱) میں کہا کہ بیس رکعت کا راز یہ ہے کہ غیر

رمضان میں سنن رواتب دس رکعتیں ہیں رمضان میں اس کو دوگنا کر دیا گیا، کیوں کہ یہ محنت اور جانفشانی کا وقت ہے۔

بہر کیف یہ عمل خلفاء راشدین کی سنت کے تحت آتا ہے، اہل مکہ اصل پر عمل کرتے تھے، بیس میں اضافہ کرنے کا کوئی سبب نہ تھا۔ گو کہ بہ قول امام شافعی یہ نفل ہے جس کی کوئی آخری حد نہیں ہے۔

رہا اہل مدینہ کا ۳۶ پر عمل تو یہ اصل پر اضافہ ہے اور یہ نفل ہے، تو امام مالک نے اس کو مستحب کیوں قرار دیا؟ پھر اہل مدینہ نے اصل پر اضافہ کیوں کیا؟ حالانکہ دوسروں کے مقابلہ میں اہل مدینہ کو اصل (بیس) کا زیادہ پابند ہونا چاہیے تھا۔

اس کا جواب جیسا کہ امام نوویؒ نے **شرح المہذب** میں اور دوسرے علماء نے نقل کیا ہے کہ یہ مسئلہ طاعت وعبادت میں محنت اور کار خیر میں منافسہ ومقابلہ کے باب سے ہے، اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اہل مکہ ہر ترویحہ کے بعد اٹھ کر ایک طواف کرتے اور طواف کی دو رکعتیں پڑھ کر دوسرا ترویحہ شروع کرتے تھے۔

یہ معلوم ہے کہ ترویحہ دو سلام سے چار رکعات کا ہوتا ہے۔ اور ہر چار رکعات پر ترویحہ اور آرام ہوتا تھا۔ اس طرح پوری تراویح میں اہل مکہ کے لیے چار طواف کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اہل مدینہ نے اس طواف کی تلافی کرنی چاہی، اور ہر طواف کے بدلہ ایک ترویحہ رکھ لیا۔

امام نووی المجموع (۳۸/۴ ط: دارالفکر بیروت) میں لکھتے ہیں: ''جہاں تک اہل مدینہ کے فعل کا تعلق ہے جس کا انہوں نے ذکر کیا تو ہمارے اصحاب اس کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا سبب یہ ہے کہ اہل مکہ ہر دو ترویحہ کے درمیان ایک طواف کرتے تھے اور طواف کی دو رکعتیں پڑھتے تھے، البتہ پانچویں ترویحہ کے بعد طواف نہیں کرتے تھے۔ اہل مدینہ نے ان کی برابری کرنی چاہی اور ہر طواف کی جگہ چار رکعتیں مقرر کر دیں۔ اس طرح ۱۶ رکعتوں کا اضافہ ہو گیا جس کا مجموعہ ۳۹ رکعت ہے۔ **واللہ اعلم**

آٹھویں صدی کے ایک اہم عالم امام زرکشی اپنی کتاب ''**اعلام الساجد باحکام المساجد** ''(ص۲٦۰) میں لکھتے ہیں کہ ماوردی اور رویانی نے کہا اس (بیس رکعت پر اضافہ) کے سبب کے بارے میں تین اقوال ہیں:

اول: اہل مکہ ہر ترویحہ کے بعد ایک طواف (سات) چکر کرتے تھے، البتہ پانچویں ترویحہ کے بعد طواف نہیں کرتے تھے، بلکہ وتر پڑھ لیتے تھے۔ اس طرح ان کو پانچ ترویحہ اور چار طوافوں کا موقع ملتا تھا۔ چوں کہ اہل مدینہ اس چار طوافوں میں ان کی برابری نہیں کرسکتے تھے اور پانچ ترویحات دونوں کے یہاں تھے، اس لئے انہوں نے ہر چار طواف کی جگہ، چار زائد ترویحات مقرر کر لئے، اس طرح کل ۹ ترویحات ہوگئے، جس میں ۳٦ رکعتیں ہوتی ہیں، اور ان کی تراویح اہل مکہ کی تراویح اور طواف کے برابر ہوگئی۔

دوم: اس کا سبب یہ ہے کہ عبدالملک بن مروان کے ۹ رلڑکے تھے ہر ایک مدینہ میں امامت کرنا چاہتا تھا، لہذا انہوں نے ہر لڑکے کو ایک ترویحہ پڑھانے کی اجازت دے دی۔ اس طرح کل ۳٦ رکعتیں ہوگئیں۔

سوم: جوار مدینہ کے نو قبیلوں میں، امامت کیلئے اختلاف ہوا تو ہر قبیلہ نے ایک ترویحہ پڑھانے کیلئے اپنا آدمی پیش کیا تو کل ۳٦ ررکعتیں ہوگئیں۔ پہلا قول اصح ہے۔ (انتہیٰ منہ)

بظاہر حقیقی سبب اول الذکر ہے؛ اس لئے کہ دوسرے قول سے گوکہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ امراء وخلفاء کے یہاں جاہ وعزت کی خاطر، مسجد نبوی میں امامت کیلئے، مقابلہ اور منافسہ ہوتا تھا۔ لیکن اس کے بغیر بھی اس کی تکمیل ہوسکتی تھی۔ کہ ہر ایک کے لیے، ایک ایک رات باری مقرر کردی جاتی اور تعداد رکعات جوں کی توں باقی رہ جاتی۔

تیسرے قول میں عصبیت کی عکاسی تو ہوتی ہی ہے، مزید براں کہ یہ اس طرح کی چیز صدر اول میں اور خصوصاً جب کہ مسجد نبوی کا ذمہ دار امام موجود ہو، بہت بعید نظر آتی ہے کہ ایک امام کے پیچھے سب عشاء کی نماز پڑھتے رہے ہوں، پھر نفل کے لیے نزاع پیدا ہوجائے۔

یہ تعداد اہل مدینہ کے ساتھ خاص تھی:

یہ معمول خاص اہل مدینہ کا تھا یا کارخیر میں مقابلہ کے شوقین حضرات بھی اس پر عمل کرتے تھے؟ علماء نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے: اکثر شافعیہ کے نزدیک یہ خاص اہل مدینہ کا معمول تھا۔ زرکشی شافعی اپنی کتاب ''اعلام الساجد'' مسئلہ (۲۰) خصوصیات مدینہ کے تحت لکھتے ہیں: ہمارے اصحاب نے کہا کہ اہل مدینہ کے علاوہ کسی کیلئے جائز نہیں کہ اہل مکہ کی برابری کی کوشش اور ان سے مقابلہ کرے۔

ولی الدین عراقی شافعی طرح التثریب (۹۸/۱) میں رقم طراز ہیں:

''ہمارے اصحاب میں حلیمی نے اپنی کتاب ''المنہاج'' میں لکھا ہے کہ جس نے اہل مکہ کے اتباع میں بیس رکعت تراویح پڑھی اس نے اچھا کیا اور جس نے اہل مدینہ کے نقش قدم پر چل کر ۳۶ رکعت پڑھی اس نے بھی اچھا کیا، اسلئے کہ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ مزید فضیلت کی تحصیل کیلئے اہل مکہ کی اقتداء کریں، مقابلہ بازی نہ تھی جیسا کہ بعض حضرات نے سمجھا ہے''۔

مالکیہ کے مذہب کا ظاہر یہ ہے کہ تراویح ۲۳ رکعت ہے یعنی مدینہ منورہ کے علاوہ میں، المجموع (۲۲/۲۷۲) میں قیام رمضان پر بحث کے ضمن میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا یہ قول منقول ہے کہ سلف کی ایک جماعت ۴۱ رکعت تراویح پڑھتی تھی جن میں تین رکعت وتر تھی جب کہ بعض حضرات ۳۶ رکعت تراویح اور ۳ رکعت وتر پڑھتے تھے''۔ ان سب میں گنجائش ہے۔ ان میں سے جس طریقہ پر بھی تراویح ادا کر لی جائے بہتر ہے۔

لہذا اہل مدینہ کے ساتھ اس تعداد کی خصوصیت کی دلیل، صرف یہی ہے کہ ایک زمانہ سے اہل مدینہ کا یہی عمل منقول ہوتا رہا ہے۔ جو ساتویں صدی ہجری تک آیا، پھر اواخر عہد اشراف اور سعودی عہد سے قبل تک گزر چکا ہے کہ اہل مکہ کے مقابلہ میں اہل مدینہ کے یہاں اس اضافہ کی وجہ یہ ہے کہ ہر دو ترویحہ کے درمیان سات چکر طواف کرتے تھے اور دو رکعت سنت طواف پڑھتے تھے۔ اس لیے اہل مدینہ نے ہر طواف کی جگہ ایک زائد ترویحہ کو

رکھا جس کے نتیجہ میں ان کے یہاں تراویح ۳۶ رکعت ہوگئی۔

اس علی الاطلاق تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معمول تمام اہل مکہ کا تھا حالاں کہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ کیوں اہل مکہ، مذاہب اربعہ کے الگ الگ چار اماموں کے پیچھے نماز پڑھتے تھے اور تراویح کے دوران طواف کا یہ معمول صرف شافعیہ کے امام کے یہاں تھا۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ ابن جبیر ۵۷۹ھ میں مکہ میں تھے، انہوں نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ تراویح میں شافعی امام، دوسرے ائمہ سے زیادہ محنت کرتا ہے، کیوں کہ وہ معمول کی تراویح (جو دس سلاموں کے ساتھ ہے) کو پوری کرتا ہے پھر جماعت کے ساتھ طواف شروع کرتا ہے سات چکر پورا کرنے اور سنت طواف پڑھنے کے بعد دوسرا ترویحہ شروع کرتا ہے پھر ''خطیبی دھماکہ'' ہوتا ہے اس کی آواز اس قدر بلند ہوتی ہے کہ پوری مسجد میں سنائی دیتی ہے اور یہ دوبارہ نماز کے آغاز کی اطلاع کے درجہ میں ہے۔ دو مرتبہ سلام پھیرنے کے بعد پھر طواف کرتے ہیں اور اسی طرح ہوتا رہتا ہے تا آں کہ دس سلام کے ساتھ بیس رکعت تراویح مکمل ہو جائے پھر دو رکعت نیز وتر پڑھتے ہیں اور لوٹ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے ائمہ معمول کی تراویح میں کوئی اضافہ نہیں کرتے۔ اور یہ معلوم ہے کہ شافعیہ بھی مکہ مکرمہ کے علاوہ، کہیں بیس رکعت سے زیادہ تراویح نہیں پڑھتے۔ واللہ اعلم

اب دوسری صدی ختم ہوگئی اور تدوین وتالیف، اجتہاد واستنباط اور ائمہ اربعہ کا دور شروع ہوگیا۔ تیسری صدی کے اوائل میں مذاہب ایک دوسرے سے ممتاز اور نمایاں ہونے لگے۔ آگے ایک فصل میں ائمہ کے مذاہب کا ذکر آئے گا، ہر مذہب کا الگ الگ بیان ہوگا لیکن یہ سب کچھ بحث کے اخیر میں، تاریخی تسلسل ذکر کرنے کے بعد ہوگا۔ نیز تراویح کی تعداد، قرأت، ختم قرآن اور اہل مکہ واہل مدینہ کے ختم قرآن کے مابین موازنہ کیا جائے گا، اس کے بعد تراویح کے مختلف انداز ذکر کر کے اس بحث کو ختم کر دیا جائے گا، پھر تیسری صدی میں تراویح کا جائزہ لیا جائے گا۔

☆☆☆☆☆

تیسری صدی ہجری:

دوسری صدی کے گزرنے پر تراویح ۳۶/رکعت اور وتر ۳/رکعت تھی، جس کا مجموعہ ۳۹/رکعت ہے۔ بعض حضرات ۴۱/رکعت کے قائل تھے جیسا کہ گزرا۔

تیسری صدی کے آغاز کے ساتھ تصور یہی تھا کہ تراویح مع وتر ۳۹ رکعت ہوگی لیکن امام ترمذیؒ متوفی ۲۷۹ھ (تیسری صدی کا اواخر) نے لکھا ہے کہ تراویح مع وتر ۴۱/رکعت ہوگئی تھی۔ امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ تراویح کے بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے: بعض حضرات وتر کے ساتھ ۴۱ رکعت کہتے ہیں اہل مدینہ کا یہی قول ہے اور ان کے یہاں مدینہ میں اسی پر عمل ہے۔

خط کشیدہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کو نقل کرتے وقت یہی معمول باقی رہا، یا موجود تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تیسری صدی میں تراویح بڑھ کر ۴۱ رکعت ہوگئی تھی؟ یعنی سابقہ ایک قول پر عمل تھا یا وہ حضرات ۳۶ رکعت کو تراویح سمجھتے تھے، جس میں ۵ رکعتوں کا اضافہ کر دیا تو مجموعہ ۴۱ رکعت ہوگیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز اور امام مالکؒ کے دور میں تعداد رکعات پر کلام کے ضمن میں اس مسئلہ پر بحث ہو چکی ہے۔ بہر حال ۳۶/رکعات تو قطعی طور پر موجود تھیں، باقی ۳۹/رکعات پوری کی جاتی تھی یا ۴۱/رکعات۔

☆☆☆☆☆

چوتھی پانچویں اور چھٹی صدی ہجری:

اس پورے وقفہ میں تراویح ۳۶ رکعت کے بجائے ۲۰ رکعت رہی ہے، اس لیے کہ مشرق وسطی کے پورے علاقے بلکہ مصر، حجاز اور عراق میں عباسیوں اور عبیدیوں کے اختلافات کے سبب زبردست خلفشار رہا ہے۔ مصر میں عبیدیوں کی حکومت چوتھی صدی کے نصف (۳۵۹ھ) میں شروع ہوئی، اور تقریبا دوسو سال تک منبر حجاز، عراق میں عباسی حکومت

اور مصر میں عبیدی حکومت کے درمیان ڈانوا ڈول رہا، یہاں تک کہ چھٹی صدی کے نصف ۵۶۷ھ میں آخری عبیدی خلیفہ نے زمام امور سنبھالی۔

حجاز پر فاطمیوں کے کنٹرول کے بعد حالات یکسر بدل گیے، خصوصاً امن وامان اور سنت کے لحاظ سے اور بدعتوں کے ظہور کے اعتبار سے، کیوں کہ فاطمی حکمراں، اس وقت کے اہل مدینہ کے مسلک پر نہ تھے،

ابن جبیر ۵۸۰ھ میں مدینہ منورہ پہونچے ہیں، انہوں نے اپنے سفر نامے میں اس وقت پھیلی ہوئی بدعتوں اور خرافات کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے جس کا حاصل یہ ہے:

> ''بروز جمعہ ۷ محرم ۵۸۰ھ کو ہم نے وہاں وہ بدعتیں دیکھیں کہ اسلام پکارا اٹھا: خدایا! مسلمانوں کو بچا۔ ہوا یہ کہ خطیب جمعہ خطبہ کے لئے پہنچا، منبر نبوی پر چڑھ گیا کہا جاتا ہے کہ اس کا مذہب کوئی پسندیدہ نہ تھا وہ مسجد نبوی میں فرض نمازوں کے مقرر امام شیخ عجمی کا مخالف تھا شیخ عجمی میں نیکی اور تقوی تھا اور اس عالی مقام جگہ میں امامت کے وہی اہل تھے۔

بہر کیف جب موذن نے اذان دی تو یہ خطیب کھڑا ہوا، یہ شیعی مسلک کا تھا آتے وقت اس کے آگے آگے دو کالے جھنڈے تھے، جن کو منبر کے دونوں طرف گاڑ دیا گیا اور وہ دونوں کے درمیان کھڑا ہوا۔ پہلے خطبہ کے بعد بیٹھ گیا تو خلاف معمول جلد اٹھنے کے بجائے بیٹھا رہا، حالانکہ دوسرے خطبہ کیلئے امام کے کھڑے ہونے کو جلد بازی کی مثال کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ پھر ''سرکش خادموں کا ایک جتھا صفوں کو چیرتے اور گردنوں کو پھاندتے ہوئے آگے بڑھا اور اس بے توفیق امام کے لیے عجمیوں اور حاضرین سے بھیک مانگنے لگا، کوئی قیمتی کپڑا دے رہا ہے تو کوئی ریشم کی لمبی چٹ پھاڑ کے دے رہا ہے جس کو دینے کے لیے ہی لایا تھا اور کوئی اپنا عمامہ اتار کر اس کے پاس پھینک رہا ہے۔ عورتیں اپنے پازیب نکال کر دے رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ناقابل بیان منظر سامنے آیا اور خطیب منبر پر بیٹھے لالچ بھری نگاہوں سے ان بھکاریوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وقت نکلنے لگا اور نماز جانے لگی۔ اور دین دار لوگ چیخ اٹھے۔ اور اس کے سامنے حرام مال کا ایک ڈھیر لگ گیا۔

جب وہ خوش ہو گیا تو کھڑے ہو کر اس نے خطبہ پورا کیا، نماز پڑھائی۔ اہل علم دین کا رونا روتے ہوئے اور دنیا میں کامیابی سے مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ اور یہ سمجھ گئے کہ اب قیامت کی علامتیں ظاہر ہو چکی ہیں''۔ (بہ اختصار)۔

اس تصویر سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ مسجد نبوی کے دوسرے امور میں کس قدر تبدیلی رونما ہو گئی ہو گی۔ اس کی تائید ابن فرحون کی ایک قلمی تصنیف سے ہوتی ہے، جس میں انہوں نے مسجد نبوی کے بارے میں لکھا ہے کہ اہل سنت کا نہ کوئی خطیب تھا، نہ امام اور نہ قاضی۔

آگے لکھا ہے کہ یہ ظاہر ایسا مصر اور حجاز پر عبیدیوں کی حکومت آنے کے بعد سے ہوا ہے، کیوں کہ ساتویں صدی کے نصف ۶۶۲ھ تک خطبہ میں صرف انہی کا نام لیا جاتا تھا، پھر عباسیوں نے حجاز پر قبضہ کر لیا اور خطبہ میں ان کا نام لیا جانے لگا۔ اس وقت سے آج تک یہی ہے۔ (یعنی مؤلف کے زمانے تک)۔

آگے لکھتے ہیں کہ ۶۸۲ھ میں آل سنان سے منصب خطابت چھین لیا گیا۔

اس کی تائید مکہ مکرمہ میں آنے والے علمی زوال سے ہوتی ہے جیسا کہ سید سباعی نے تاریخ مکہ (۱۶۵/۱) میں، عہد عباسی دوم میں، مکہ مکرمہ کی علمی حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے: ''اور جلد ہی مکہ مکرمہ کے بڑے بڑے علماء، دوسرے شہروں میں چلے گئے، اور علمی سرگرمی ماند پڑ گئی اور چوتھی صدی ہجری آتے آتے ملک میں علمی کمزوری کی نشانیاں واضح طور پر نظر آنے لگیں۔

اس دور میں عالم اسلام میں شدید دینی اختلاف رونما ہو گئے، خوارج سرگرمی سے تبلیغ کر رہے تھے۔ معتزلہ اور خوارج کے اقوال عام تھے۔ اور مختلف شیعی مذاہب پھیل چکے تھے۔

آگے لکھتے ہیں:

دوسرے مذہب کے برخلاف شیعیت کو، مختلف اوقات میں، مکہ، مدینہ اور حجاز میں اپنے ہم نوا مل گئے۔

مکہ اور مدینہ میں شیعہ حامیوں کی موجودگی کی تائید تاریخ مکہ میں سید سباعی کے اس

قول سے ہوتی ہے کہ جلد ہی اشراف مکہ نے، فاطمیوں سے تعلقات بنانے کے بعد، اذان میں ''**حی علی خیر العمل**'' کا اضافہ کر دیا، جو فاطمیوں کی تقلید تھی۔ یہ چوتھی صدی ہجری (۳۵۸ھ) کا واقعہ ہے۔

موصوف نے تصریح کی ہے کہ مکہ و مدینہ میں علمی حالت کم زور پڑ گئی تھی، اشراف مکہ شیعیت کے حامی تھے، اس وقت کی سیاست یہی تھی، کیونکہ عباسیوں کا دارالخلافت بغداد تھا اور فاطمیوں کا دارالخلافت مصر تھا، اور یہ دونوں ہی حجاز سے دور تھے۔ حرمین کی حیثیت کے پیش نظر دونوں حکومتیں، منبر حرمین پر قبضہ کرنا چاہتی تھیں۔ تا کہ دوسرے علاقوں میں ان کی تائید ہو سکے؛ کیوں کہ حرمین پر جس کا کنٹرول ہوتا تھا اسی کو خلافت کا حق دار تصور کیا جاتا تھا اور اسی کا فائدہ اٹھا کر مکہ کے حکمراں، دونوں حکومتوں کے عطیات لوٹ رہے تھے۔ اور یہی سلسلہ جاری رہا۔

آگے لکھتے ہیں:

مکہ اور مدینہ میں علمی کمزوری، چوتھی، پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں، مکمل طور پر برقرار رہی۔

علمی کمزوری کی سید سباعی کی بیان کردہ نوعیت اور نماز جمعہ سے متعلق ابن جبیر کا بیان کردہ واقعہ ان دونوں کے پیش نظر یہ بات قطعی طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ اس وقت (حجاز پر) فاطمی حکومت کے دور میں تراویح میں کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور آئی ہوگی۔ فاطمی حکومت عالم اسلام میں ۵۶۷ھ تک جاری رہی۔ اور آخری عبیدی خلیفہ 'عاضد' کی موت پر ختم ہوئی۔ لیکن تبدیلی کس نوعیت کی تھی؟ آیا حکمراں طبقہ کے مذہب شیعیت کو اختیار کر لیا گیا تھا، یا امام شافعی کے مذہب کو جو یہاں منتقل کر دیا گیا جو مکہ میں رائج تھا؟

یاد رہے کہ شیعوں کا مذہب تراویح کے بارے میں (جیسا کہ ان کے ائمہ مثلاً حلی کہتے ہیں) یہ ہے:

''ماہ رمضان میں نفل نماز: مشہور ترین روایت کے مطابق نوافل راتبہ کے علاوہ، پورے مہینے میں ایک ہزار رکعتیں مستحب ہیں، ہر رات میں بیس رکعت پڑھے: آٹھ رکعت مغرب کے بعد، اور بارہ رکعت عشاء کے بعد، اظہر یہی ہے۔اور اخیر عشرہ میں ہر رات، سابقہ ترتیب کے ساتھ تیس رکعت پڑھے گا۔اور تین طاق راتوں میں مقررہ رکعتوں کے علاوہ ہر رات میں سو رکعات پڑھے گا۔

اس سلسلہ میں شیعوں کے یہاں تفصیل ہے جسے دیکھنا ہوان کی کتاب ''**الشریعة**''(۱/۶۵) کا مطالعہ کرے۔

بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ تراویح کے بارے میں تبدیلی امام شافعی کے مسلک کی شکل میں ہوئی، کیوں کہ ابوزرعہ اپنے والد کے بارے میں کہتے ہیں کہ جب میرے والد مسجد نبوی میں امام ہوئے تو اس کو (یعنی تراویح کو) سابقہ طریقہ کے مطابق ۳۶ رکعات کر دیا۔البتہ وہ شروع رات میں بیس رکعت (جیسا کہ معمول تھا) اور آدھی رات کے بعد ۱۶ رکعتیں پڑھاتے تھے تا کہ اختلاف سے بچ سکیں۔

خط کشیدہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے امام شافعی کے مسلک کو اختیار کیا تھا، کیونکہ اس کے بعد انہوں نے اختلاف سے بچنے کی بات کہی ہے۔اور (جیسا کہ معمول تھا) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے اسی تعداد پر عمل تھا۔ابوزرعہ آٹھویں صدی کے ایک بڑے شافعی عالم ہیں۔

فاطمی دور میں، مکہ اور مدینہ میں امام شافعیؒ کے مسلک پر ہی عمل تھا۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ ابن جبیر نے چھٹی صدی ہجری میں جب کہ مکہ میں فاطمی حکومت تھی، رمضان میں ختم قرآن کی نوعیت ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ رمضان کا چاند ۲۹ دسمبر دوشنبہ کی رات میں نظر آیا۔اہل مکہ نے یک شنبہ سے روزہ رکھا تھا۔ان کا دعوی تھا کہ رویت ہو چکی ہے، یہ دعوی ثابت نہ تھا۔لیکن امیر مکہ نے فرمان جاری کر دیا اور یک شنبہ کی رات کو روزہ کا اعلان کر دیا، کیوں کہ یہ خود اس کے اپنے مذہب اور اسکے علوی شیعہ حامیوں کے

مذہب کے موافق تھا؛ کیوں کہ ان کے نزدیک یوم شک کا روزہ فرض ہے۔ جیسا کہ لکھا ہے۔ آگے لکھتے ہیں:

تراویح کیلئے الگ الگ امام مقرر ہوئے۔ شافعیہ کی جماعت سب سے بڑی تھی، انہوں نے مسجد کے ایک گوشہ میں اپنے امام کو کھڑا کردیا، اسی طرح حنابلہ، حنفیہ اور زیدیہ وغیرہ نے۔

موصوف نے لکھا ہے کہ سارے اہل مکہ صرف بیس رکعت تراویح پڑھتے تھے۔ اور یہ شافعی امام تراویح میں سب سے زیادہ محنت کرتا ہے، کیوں کہ معمول کی تراویح (دس سلام) مکمل کرنے کے بعد وہ با جماعت طواف شروع کرتا ہے۔

آگے ابن جبیر نے ان کے طواف اور واپسی کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

''دس سلام سے فراغت تک یہی سلسلہ جاری رہتا اور بیس رکعت پوری کر کے پھر دو رکعت مزید، اور پڑھتے تھے، جب کہ دوسرے ائمہ معمول کی تراویح پر زیادتی نہیں کرتے''۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور (عبیدی حکومت کے دور) میں تراویح ہمیشہ امام شافعی کے مذہب کے مطابق بیس رکعت ہی رہی۔ یہاں تک کہ امام ابوزرعہ نے اس کو دوبارہ زندہ کیا ہاں ادائیگی کی شکل کچھ مختلف تھی، اس کا ذکر آٹھویں صدی کے ضمن میں آئے گا۔ ان شاء اللہ

☆☆☆☆☆

آٹھویں صدی:

اس صدی میں تراویح ۳۶ رکعت ہوگئی، البتہ ادائیگی کا انداز مختلف تھا، حافظ ولی الدین ابوزرعہ عراقی کے والد امام زین الدین ابوالفضل کی کتاب الترتیب فی شرح التقریب سے یہی سمجھ میں آتا ہے، ابوزرعہ کی ولادت ۷۲۵ھ اور وفات ۸۱۸ھ میں ہوئی۔ یعنی ان دونوں حضرات نے اوائل آٹھویں صدی اور اوائل نویں صدی کا درمیانی زمانہ پایا ہے۔

ابوزرعہ نے یہ حدیث کہ: رسول اللہ نے رمضان ایک رات مسجد میں نماز پڑھی،

تو کچھ لوگوں نے آپ کے پیچھے پڑھ لیا........الحدیث نقل کر کے حدیث کی تشریح اور متعلقہ مسئلہ کو ذکر کیا، پھر تراویح کی تعداد رکعت، اس کے بارے میں اختلاف بیس سے زیادہ پڑھنے کے بارے میں بحث اور یہ اہل حدیث کا طریقہ ہے، یہ سب ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے اور یہی مقصود بالذکر ہے:

جب میرے والد رحمہ اللہ مسجد نبوی کے امام ہوئے، تو انھوں نے اس کے قدیم طریقہ کو زندہ کیا، البتہ اکثر لوگوں کے معمول کی رعایت رکھی، چنانچہ وہ ابتدائی رات میں بیس رکعت پڑھتے، جیسا کہ معمول تھا پھر رات کے آخری حصہ میں ۱۶ رکعت مزید پڑھتے تھے اس طرح رمضان میں با جماعت دو قرآن ختم کر لیا کرتے تھے، اہل مدینہ کا معمول ان کے بعد یہی رہا، اور اب تک یہی ہے، (شرح التقریب ۹۸/۱) ان کے قول ''جب میرے والد رحمہ اللہ مسجد نبوی کے امام ہوئے، تو انھوں نے اس کے قدیم طریقہ کو زندہ کیا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد سے پہلے تراویح میں کوئی تبدیلی ہوئی تھی۔

''چنانچہ وہ ابتدائی رات میں بیس رکعت پڑھا کرتے تھے، جیسا کہ معمول تھا'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک ان کے یہاں عام معمول وعادت بیس رکعت پڑھنے کی تھی۔

''اہل مدینہ کا معمول ان کے بعد یہی رہا، یعنی بیس رکعت تراویح شروع رات میں اور ۱۶/اخیر رات میں جن کا مجموعہ چھتیس رکعت ہے۔'' ابتک یہی ہے'' سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب کتاب (امام ابوالفضل کے لڑکے) کے زمانے تک یہی رہا ہے، لیکن ان کے بعد کیا ہوا کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ صاحب کتاب کی وفات نویں صدی کے اوائل ۸۱۸ھ میں ہوئی ہے۔

نویں صدی:

ابوزرعہ کی سابقہ عبارت کے پیش نظر تراویح کا یہی معمول ۳۶ رکعت سابقہ تفصیل کے ساتھ رہا، یعنی شروع رات میں ۲۰ رکعت اور اخیر شب میں ۱۶ رکعت، اور یہی معمول نویں صدی کے اواخر اور دسویں صدی کے اوائل تک برقرار رہا، جیسا کہ سمہودی کی اگلی عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔

دسویں صدی:

دسویں صدی کے آغاز میں مسجد نبوی میں ۳۶ رکعت تراویح ہوتی تھی، امام سمہودی اپنی کتاب ''وفاء الوفا بأخبار دار المصطفیٰ ۱/۸۴(۸۰) میں مدینہ منورہ کی کی خصوصیات کے تحت رقمطراز ہیں:

''مسئلہ ۸۰: اہل مدینہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ۳۶ رکعت تراویح پڑھتے ہیں، جیسا شافعیہ کے نزدیک مشہور قول ہے، رافعی اورنووی نے کہا امام شافعی نے کہا: میں نے اہل مدینہ کو ۳۹؍رکعت تراویح پڑھتے ہوئے دیکھا، جن میں تین رکعت وتر ہے، ہمارے اصحاب نے کہا، اہل مدینہ کے علاوہ کسی کے لئے ایسا نہیں کرنا چاہئے، کیوں کہ مدینہ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت گاہ ہے، اور آپ کی قبر اطہر یہیں ہے، یہ شرف کسی اور کو حاصل نہیں۔

سمہودی کا انتقال ۹۱۱ھ میں ہوا، خود شافعی المسلک تھے، بعد میں ان کے لڑکے مسجد نبوی میں شافعیہ کے امام مقرر ہوئے،۔

موصوف اسی کتاب ص ۸۵ پر لکھتے ہیں:

'' تراویح کی یہ تعداد اب تک مدینہ منورہ میں باقی ہے، البتہ بیس رکعت عشاء کے بعد اور ۱۶ رکعت اخیر رات میں ادا کرتے تھے۔''

اس سے صراحتاً اس تعداد اور طریقہ کا علم ہوتا ہے، جس کو امام ابوزرعہ رحمہ اللہ نے دوبارہ زندہ کیا تھا۔

تنبیہ

ماسبق میں آچکا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے تعداد تراویح ۳۹ رکعت ذکر کی ہے، جن میں تین رکعت وتر ہے، لیکن نماز وتر کا طریقہ کیا ہوگا، اس کی تفصیل نہیں کی، امام شافعیؒ کے یہاں مشہور یہ ہے کہ تین رکعات الگ الگ ہیں۔ لیکن سید سمہودی وتر کی کیفیت میں کسی

تبدیلی کا ذکر کرتے ہیں، چنانچہ ان کی سابقہ عبارت کے بعد یہ موجود ہے:

''وتر کے مسئلہ میں ان میں کچھ خلل ہوا، جس پر ہم کتاب **مصابیح القیام فی شھر الصیام** میں تنبیہ کر چکے ہیں۔ میں نے اس کی ایک صورت نکالی تھی، جس سے وہ خلل دور ہوگیا، انہوں نے ایک زمانہ تک اس پر عمل کیا، پھر بعض حضرات نے ذاتی جذبات ومفادات سے مغلوب ہوکر سابقہ حالت پر لوٹا دیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وتر کے مسئلہ میں کوئی خلل تھا، اور اس پر انہوں نے تنبیہ کی تھی، لیکن یہ خلل اور تنبیہ کیا تھی؟ معلوم نہیں، جب کہ یہ طے ہے کہ وتر میں اختلاف محض ادائیگی میں ہے کہ تین رکعات کو ایک ساتھ پڑھا جائے، یا الگ الگ، احناف وتر کو مغرب کی طرح تین رکعات ایک ساتھ پڑھتے ہیں، جب کہ جمہور دو رکعات پر سلام پھیر کر ایک رکعات الگ سے پڑھتے ہیں۔

اسی طرح قنوت کے تعلق سے یہ اختلاف ہے کہ حنابلہ اور احناف وتر میں قنوت پڑھتے ہیں ہاں حنابلہ جہراً اور حنفیہ سراً پڑھتے ہیں، شافعیہ و مالکیہ صبح کی نماز میں قنوت پڑھتے ہیں، البتہ شافعیہ رکوع کے بعد اور مالکیہ رکوع سے پہلے سے پڑھنے کے قائل ہیں۔

شاید یہ خلل تعدادائمہ اور وتر کی متعدد صورتوں کے سبب تھا، جیسا کہ اس کی تشریح ''چودھویں صدی'' پر بحث کے وقت آئے گا، وہاں وتر سے متعلق شیخ سلیمان عمری کے رسالہ اور اس وقت کے علماء مسجد نبوی کی رسالہ پر آراء ذکر کی جائیں گی۔

☆☆☆☆☆

گیارہویں صدی:

غالب گمان یہ ہے کہ تراویح کے تعلق سے اس صدی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، اس لئے کہ سمہودی متوفیٰ ۹۱۱ھ کے کلام سے معلوم ہو چکا کہ تراویح ۳٦ر رکعات اور وتر تین رکعات کل ۳۹ر رکعات تھیں، جن کو ابوزرعہ رحمہ اللہ کے طریقہ پر ادا کیا جاتا تھا۔

پھر شیخ عبدالغنی نابلسی کے بارہویں صدی ہجری کے سفرنامہ مدینہ منورہ سے یہی

معلوم ہوتا ہے کہ تراویح ۳۹ رکعات ہی تھی، جس سے یقین ہوتا ہے کہ ان کے دور تک یہی معمول رہا ہے، جس کو انہوں نے مشاہدہ سے بالتفصیل لکھا ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

☆☆☆☆☆

بارہویں صدی:

بارہویں صدی میں تراویح کے متعلق وہی معمول رہا، جو دسویں صدی میں تھا یعنی بیس رکعات شروع رات میں اور سولہ رکعات اخیر رات میں، اور اس سولہ رکعات کو ''سته عشريه'' کہتے تھے، جیسا کہ شیخ نابلسی کے سفر نامہ مدینہ منورہ میں موجود ہے، جس کو ماہنامہ ''العرب'' نے ص ۴۳۰، جلد ا شمارہ نمبر ۵ ذوالقعدہ ۱۳۸۶ھ میں شیخ نابلسی کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

''موصوف کہتے ہیں، ہم شیخ سید علی سمہودی کے یہاں نماز پڑھتے تھے، ان کے لڑکے امام ہوتے تھے، وہ اس وقت کے ائمہ شافعیہ میں سے ایک تھے''۔

موصوف نے مزید کہا: اہل مدینہ کے یہاں معمول ہے کہ تراویح سے فراغت کے بعد حرم سے نکل جاتے ہیں، اور اس کے دروازے مقفل کر دیے جاتے ہیں، جب کہ کچھ رات (تقریباً تین یا چار گھنٹے) گزر جاتی ہے، تو بہت سے حضرات واپس آتے ہیں، حرم کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، قندیلیں روشن کر دی جاتی ہیں، اور سولہ رکعات با جماعت ادا کرتے ہیں، جس کو وہ ''سته عشريه'' کہتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں تراویح کا معمول وہی تھا، جو دسویں صدی میں سمہودی کے عہد میں تھا کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، ہاں اخیر رات کی ۱۶/رکعات کو وہ لوگ ''سته عشريه'' اس کی تعداد کے لحاظ سے کہتے تھے۔ اس سے اس بات کا یقینی ثبوت ہوتا ہے کہ دسویں صدی کے بعد بھی تراویح کا وہی معمول باقی رہا، جو دسویں صدی میں تھا، یعنی ۳/رکعات وتر کے ساتھ ۳۹ رکعات جن میں سے ۲۰ رکعات شروع رات میں اور ۱۶/رکعات اخیر شب میں ادا کی جاتی تھیں۔

البتہ ایک نئی چیز موجود تھی یا وہ پہلے سے چلی آرہی تھی، وہ یہ ہے کہ فرائض کے ائمہ کی تعداد...... میں تراویح کے ائمہ بھی متعدد تھے، اس وقت بھی صرف دو مذاہب حنفیہ اور شافعیہ کے ائمہ موجود تھے، اور مذہب مالکی کے ساتھ ائمہ ثلاثہ کے چند خطباء تھے، ماہنامہ العرب جلد: ا، شمارہ: ۴۔ شوال ١٣٨٦ اص ٣٣٤ میں بحوالہ سفرنامہ شیخ نابلسی یہ لکھا ہے:

''حرم شریف میں کل پندرہ ائمہ تھے، کچھ حنفی اور کچھ شافعی، اور اکیس خطیب تھے، جن میں سے ١٢ حنفی، ٨ شافعی اور ایک مالکی خطیب تھا''۔

ائمہ باری باری نماز پڑھاتے تھے، روزانہ ایک حنفی امام، اور ایک شافعی امام پڑھاتے تھے، ظہر سے شروع کرتے اور نماز فجر پر ختم کرتے تھے، پہلے شافعی امام نماز پڑھاتا ، پھر حنفی امام پڑھاتا تھا، البتہ مغرب میں پہلے حنفی امام پڑھاتا تھا، کیوں کہ اس کے نزدیک مغرب میں تاخیر مکروہ ہے۔

حنفی امام ایک دن محراب نبوی (جو روضہ شریف میں ہے) پڑھاتا اور اس دن شافعی امام اس محراب میں پڑھاتا تھا جو منبر کے پیچھے ہے، جس کو سلطان سلیمان علیہ الرحمہ و الرضوان کا محراب کہتے ہیں، دوسرے دن شافعی امام اس جگہ پڑھاتا اور حنفی اس کی جگہ پر پڑھاتا تھا یہ ائمہ اپنے اپنے وقت پر تراویح بھی اپنی جماعت والوں کو پڑھاتے تھے۔ البتہ امام ختم قرآن کی رات میں صرف شافعی امام ہوتا، سب لوگ ایک ساتھ عشاء و تراویح ایک ہی امام (جو شافعی ہوتا تھا) کے پیچھے پڑھتے تھے، اور اس دن شافعی امام ہی کو آگے بڑھایا جاتا تھا، فرائض پہلے وہی پڑھاتا، اور تراویح بھی پہلے وہی ختم کرتا تھا، جس کیلئے ایک بڑا مجمع اور جشن ہوتا۔ جو کچھ اس طرح سے ہوتا تھا۔

☆☆☆☆☆

بارہویں صدی میں مدینہ منورہ میں ختم قرآن کا انداز:

نابلسی نے اپنے سفرنامہ میں، تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر اپنی شرکت کا حال لکھا ہے، وہ روضہ شریف میں علماء شافعیہ کے ساتھ موجود تھے، اور خود ساری چیزوں کا

مشاہدہ کیا ہے۔

ماہنامہ العرب جلد ا شمارہ ۹ ربیع الاول ۱۳۸۷ھ نے بحوالہ سفر نابلسی لکھا ہے:

''نابلسی نے کہا: لوگ ہر رمضان میں تراویح میں ایک ختم کرتے ہیں، یہ ختم ۲۷ ویں کی شب میں ہوتا ہے، اور حنفیہ ۲۹ ویں رمضان کی رات کو ختم کرتے ہیں'' اور نابلسی حنفی المذہب تھے۔

آگے لکھا ہے:

''ہم روضہ شریف میں بیٹھ گئے، علماء، اعیان اور اکابر حسب طبقات و درجات آ گئے ہر ایک کے لیے اس کے درجات کے مطابق جائے نماز بچھی ہوئی تھی، حنفیہ کے مفتی، شافعیہ کے مفتی، قاضی مدینہ، شیخ حرم، خدام حجرہ مطہرہ، خطباء و ائمہ سب لوگ آ گئے، امیر حجاز شریف سعد بن زید اپنی اولاد اور فوج کے ساتھ مکہ کی طرف چلے گئے تھے۔ (یعنی وہ سفر کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکے، غالباً اس سے بتانا چاہتے ہیں کہ اس طرح کے موقع پر وہ حاضر ہوتے تھے)

آگے لکھا ہے:

''تمام مؤذن آ گئے، اقامت کہی، امام نے تمام لوگوں کو عشاء پڑھائی، یعنی ان تمام لوگوں نے عام دنوں کے برخلاف ایک امام کے پیچھے عشاء کی نماز ادا کی، جو اس بات کی تمہید تھی کہ تمام لوگ تراویح بھی ایک ہی امام کے پیچھے پڑھیں گے''۔

چنانچہ انھوں نے آگے کہا:

امامت کی باری نوجوان فاضل جامع کمالات سید عمر بن سید سمہودی شافعی کی تھی، یعنی شافعیہ میں سے بھی چند امام تھے، جو باری باری شافعیہ کو نماز پڑھاتے تھے، یہی حال احناف کے یہاں بھی تھا، ان کے بھی چند امام تھے جو باری باری امامت کراتے تھے، جیسا کہ تعداد ائمہ کے بارے میں بتایا جا چکا ہے۔

آگے نابلسی نے کہا (یہی یہاں مقصود بالذکر بھی ہے):

پھر انھوں نے لوگوں کو تراویح کی نماز پڑھائی، اور اس سے فارغ ہو گئے، یعنی اس رات شافعی امام سید عمر بن سمہودی شافعی نے تمام لوگوں کو تراویح کی نماز پڑھائی۔

آگے ختم قرآن کے اہتمام کا ذکر کرتے ہوئے نابلسی نے کہا:

'' پھر مؤذن روضہ شریف میں جمع ہو گئے، اور قصائد پڑھے، جن میں نعت، ذکر روضہ شریف، حجرہ مطہرہ، خشوع وخضوع رونے کی فضیلت کا ذکر تھا، وداع رمضان میں قصائد پڑھے گئے، جن کو سن کر لوگ چیخ اٹھے، زبردست ہیبت، جاہ وجلال اور خضوع وخشوع کا ماحول تھا۔

بہت سی شمعیں روشن کی گئیں، اور ان کو روضہ شریف میں لائن سے رکھ دیا گیا تھا، متعدد قندیلیں روشن تھیں، عنبر اور عود کی خوشبو اٹھ رہی تھی، گلاب کا پانی، بارش کی طرح چھڑکا جا رہا تھا، حاضرین کی ہر جماعت کے سامنے ایک طشت میں پھول، چمیلی خوشبو دار کلیاں قسم قسم کے ریحان رکھے ہوئے تھے، اور آخر میں فراغت کے بعد شیخ حرم نے امام کو سونے چاندی کی بنی اعلیٰ خلعت عطا کی، امام صاحب محراب نبوی میں تشریف فرما تھے، لوگ اٹھ کر ان کو ختم قرآن کی مبارکباد دینے لگے، اور ہزاروں راتوں سے افضل اس شب قدر میں ہمیں پورا پورا ثواب ملا، ہم زیارت نبوی سے مشرف ہوئے۔

آگے نابلسی نے ایک مجذوب یمنی کا ذکر کیا، وہ صحن حرم نبوی کے ایک کنویں کے مشک کا پانی لے کر گھومتا تھا، وہ کہتا تھا: شفا ہے شفا ہے، لوگوں سے اس کی اجرت نہیں لیتا تھا۔

پھر نابلسی نے اس جشن کے اختتام پذیر ہونے اور قندیلوں اور شمعوں کو گل کرنے کا ذکر کیا۔

اس موقع پر بتا دینا چاہیے کہ ختم قرآن کا یہ اہتمام مکہ مکرمہ میں صدیوں سے چلا آ رہا ہے، چنانچہ ابن جبیر نے اس جشن کا ذکر کیا، اور اپنے سفرنامہ میں اس سے کہیں زیادہ بڑا جشن بتایا ہے، اس کا ذکر اس بحث کے اخیر میں آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

اسی طرح یہ جشن واہتمام اخیر تر کی دور میں مختلف انداز سے رائج تھا، اس کا ذکر ان

شاءاللہ چودھویں صدی، اخیر عہد اتراک واشراف پر بحث میں آئے گا۔

مستبعد نہیں کہ ختم قرآن کی یہ شکل بہت پہلے سے چلی آرہی ہے، بارہویں صدی کی ایجاد نہ ہو، خصوصاً جب کہ اس ختم قرآن کے لیے شافعیہ کو آگے بڑھایا جاتا ہے، جو بہت پرانے زمانے سے امامت کے مستحق سمجھے جاتے تھے، حتیٰ کی ترکی دور میں بھی، حالانکہ ترکی حنفی مذہب کے حامی تھے، شاید یہ فاطمی دور کی یاد ہے۔ واللہ اعلم۔

☆☆☆☆☆

تیرہویں صدی (آخر ترکی عہد)

تیرہویں صدی میں تراویح اپنی سابقہ حالت پر قائم تھی، کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، کیونکہ یہ پورا علاقہ مکہ ومدینہ براہ راست اشراف کے ماتحت تھا، گوکہ خلافت عثمانیہ کے تابع تھا۔

بتایا جا چکا کہ حجاز پہلے سے ہی اشراف کے ماتحت تھا، گوکہ عباسی حکومت اور فاطمی حکومت کے درمیان ڈانواڈول رہا ہے، یہاں تک کہ عثمانی خلافت قائم ہوئی، جس کے پہلے خلیفہ سلطان سلیم مصر میں ۹۲۲ھ میں خلیفہ بنے، اور ۹۲۳ھ میں مکہ مکرمہ کے منبر پر ان کے نام کا خطبہ پڑھا گیا، حجاز عثمانی خلافت کے تابع ہو کر اشراف ہی کے کنٹرول میں رہا، پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی، اور اس کے خاتمہ کے ساتھ خلافت بھی ختم ہوگئی، مدینہ منورہ کے آخری ترکی قائد فخری باشا تھے، جو ترکی حفاظتی دستہ کے سپہ سالار تھے، اور انھوں نے ۱۳۳۷ھ میں مدینہ منورہ کو سپرد کر دیا۔

مکہ مکرمہ میں اشراف کے آخری امیر شریف حسین اور مدینہ منورہ میں شریف علی تھے۔

۱۳۴۵ھ میں بلاد عربیہ میں شریف حسین کی بادشاہت کا اعلان ہوا۔

بہرکیف اس دور میں بھی مدینہ منورہ میں اشراف ہی کا براہ راست کنٹرول تھا، خواہ ترکی دور کا آغاز ہو یا اواخر۔ اس لیے تیرہویں صدی ہجری میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔

☆☆☆☆☆

چودہویں صدی:

چودہویں صدی کے آغاز میں مسجد نبوی میں تراویح کا سابقہ معمول برقرار رہا چودہویں صدی کے نصف تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

بظاہر تعدادِ رکعات یا طریقہ ادائیگی کسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، وہی ۳٦ رکعات تراویح تین رکعات وتر تھی، بیس رکعات شروع رات میں پڑھی جاتی تھی، سولہ رکعات اخیر شب میں اوراس کو ''ستہ عشریہ'' کہا جاتا تھا، جیسا کہ نابلسی نے بارہویں صدی کے تعلق سے ذکر کیا تھا۔ ہاں چودھویں صدی کے آغاز میں ایک نئی چیز دیکھنے میں آتی ہے کہ ائمہ مذاہب اربعہ کے علاوہ اور بہت سے ائمہ اور متعدد جماعتیں ہوتی تھیں جو کم وبیش ہوتی رہتی تھی، لیکن مستقل یا سرکاری طور صرف چھ ائمہ تھے

ا۔ حاکم اس کے حاشیہ برداروں کا امام۔

۲۔ قاضی اوراس کے کاتبین اوراس کے معاونین کا امام۔

۳۔ اغوات (آغاؤں) اوران کے ساتھ پڑھنے والوں کا امام۔

۴۔ مفتی صاحب کا امام

۵۔ سپہ سالار کا امام

٦۔ عورتوں کا امام

۷۔ گھروں کے ائمہ

بعض اعلیٰ گھرانے ایک خاص امام کے پیچھے، اپنے افراد خاندان کے لیے تراویح کا انتظام کرتے تھے، یہ ائمہ تراویح کی نماز امام راتب کی نماز کے دوران پڑھاتے تھے، یعنی دوسرے ائمہ کے ساتھ ساتھ البتہ ان کے یہاں قرأت کچھ مختلف ہوتی تھی، وہ بعض آیتیں پڑھتے یا صرف چھوٹی صورتیں، کیوں کہ وہ کاروباری ہوتے تھے، فرض نمازوں کے مقرر ائمہ کے پیچھے پڑھنے کے لئے وہ انتظار نہیں کر سکتے تھے، لیکن دوسرے ائمہ مذاہب عام لوگوں کے لئے تراویح پڑھاتے تھے، اور دو ختم کرتے تھے، ایک ختم ابتدائی رات والی تراویح میں

اور دوسرا ختم آخری شب والی نماز میں جس کو وہ ستہ عشریہ کہتے تھے۔

ان ائمہ کے لئے مخصوص جگہیں تھیں۔اغوات کا امام اپنے مخصوص چبوترے پر اور محراب تہجد میں جو اس وقت حجرہ کے پیچھے اور حجرہ اور چبوترے کے درمیان ہے، یہی چبوترہ اغوات کا چبوترہ کہلاتا ہے، اور یہی اصحاب صفہ کی جگہ تھی، پڑھاتے تھے۔عورتوں کا امام ان کو قفس میں تراویح پڑھاتا تھا، قفس لکڑی کا ایک مزین جال تھا جس کی وجہ سے نگاہ اندر نہیں جاتی تھی، یہ جال باب نساء کی طرف مشرقی حصہ میں تھا، اور اس وقت کی مسجد کے پیچھے باب مجیدی تک شمال میں اور چوڑائی میں پورے مشرقی حصہ میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ جال تقریباً تین میٹر اونچا تھا، بچوں اور عورتوں اور بضرورت اغوات کے علاوہ کسی کو اندر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ قفس حالیہ جدید توسیع سے قبل ختم کردیا گیا ہے۔

روضہ شریف کے شیخ کا امام، ابتدائی کنکری والے حصہ میں کھڑا ہوتا تھا، جو مسجد کے پیچھے سے متصل باب رحمت اور باب نساء کے درمیان واقع ہے۔

سید سعید پاشا شامل نے مجھے یہ تعجب خیز واقع سنایا کہ شیخ روضہ کا امام پورے مہینے ہر رات تراویح میں ایک قرآن ختم کرتا تھا، ان کا کہنا تھا کہ وہ اس قدر تیزی سے پڑھتا تھا کہ کانپ اٹھتا تھا اور خود کو فراموش کر بیٹھتا تھا، اور بسا اوقات ایک ہی رکعت میں ایک پارہ پڑھ لیتا تھا۔

میں نے صدر قراء مسجد نبوی شیخ حسن شاعر سے سنا کہ ایک شخص رمضان میں رات بھر تراویح میں پورا قرآن پڑھتا، لیکن وہ ایسا صرف ایک بار کرتا تھا، تاکہ اچھی طرح یاد رہے، ان کا کہنا تھا کہ وہ اس قدر تیزی سے پڑھتا تھا کہ آیتوں کے شروع یا آخر کے علاوہ کچھ سنائی نہیں دیتا تھا، ظاہر ہے کہ ایسا حفظ کو مضبوط کرنے کے لیے ہے، غور وفکر کے ساتھ اس طرح نہیں پڑھا جاسکتا۔

شیخ حرم کی نماز:

موجودہ شیخ حرم سید احمد رفاعی سے میں نے سنا کہ اتراک واشراف کے دور میں شیخ بسا اوقات تراویح جاڑے میں اپنے چبوترے پر پڑھتا تھا، شیخ حرم کا چبوترہ ایک چھوٹا تھا، جو

باب جبریل سے داخل ہونے پر دائیں طرف، باب جبریل اور اغوات کے چبوترے کے درمیان ہے، اور اب تک موجود ہے، جس پر تین صف لگ سکتی ہے، ہر ہر صف میں تین آدمیوں کی گنجائش ہے، تقریباً نصف میٹر اونچا ہے، وہاں شیخ حرم اور ان کے متعلقین کا مخصوص امام نماز پڑھاتا تھا، شیخ حرم وہاں جاڑے میں تراویح پڑھتے تھے، جبکہ گرمی میں ابتدائی کنکری والے حصہ میں پڑھتے تھے، اس کنکری والے حصہ میں تراویح کا معمول اس سے بھی ثابت ہوتا ہے، نابلسی نے لکھا کہ ایک رات ہم تراویح پڑھ رہے تھے، بارش آ گئی، تو ہم اندر چلے گئے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گرمی میں کنکری والے حصہ میں اور جاڑے میں اندر پڑھتے تھے، اور یہ خصوصی عمل تھا، کیوں کہ پنجگانہ اماموں کی نماز مخصوص خاص محرابوں میں ہوتی تھی، اور وہیں تراویح پڑھتے تھے، جیسا کہ اس کا تذکرہ ملتا ہے۔

عہد سعودی میں بھی بعض امراء مدینہ اسی کنکری والے حصہ میں گرمی میں تراویح پڑھتے تھے، جس کا ذکر آئے گا، ان شاءاللہ۔ ان چھ ائمہ کے علاوہ، اعلیٰ گھرانوں کے امام ہوتے تھے، کسی گھرانے کے بڑے بوڑھے یہاں تک کہ سب بچے جمع ہو جاتے تھے، اور ان کا مخصوص امام مسجد نبوی کے خاص حصہ میں پورے رمضان تراویح ختم ہونے تک تراویح پڑھاتا تھا۔

نئے طرح کی ایک انوکھی عارضی امامت:

پورا قرآن حفظ کرنے والے بچوں کی امامت جب کوئی بچہ سال کے کسی حصہ میں حفظ قرآن مکمل کر لیتا، تو رمضان آنے کا انتظار کرتا تھا، رمضان آنے پر وہ اپنے استاذ، والد اپنے ساتھیوں اور کچھ دوست اقارب کے ساتھ مسجد نبوی آتا، اور وہ بچہ پورے مہینہ بھر میں یا اس سے کم میں تراویح میں پورا قرآن سناتا تھا، حاضرین اور اس کے استاذ اس کے پیچھے نماز میں قرآن سنتے رہتے۔ یہ ایک طرح سے حفظِ قرآن کا امتحان اور سند ہوا کرتی تھی جب بچہ تراویح میں پورا قرآن سنا لیتا، تو اس کے والد کی طرف سے اپنی وسعت کے مطابق جشن ختم قرآن ہوتا تھا۔

بسا اوقات بچہ کا والد اس جشن میں بہت کچھ خرچ کر دیتا تھا، کہ ختم قرآن کی خوشی

ہوتی تھی، بچے کے استاذ اور حاضرین کو کھانے اور حلوہ کے علاوہ جوڑے اور قیمتی ہدیہ عطا کر دیتا تھا، پھر بچہ کو ایک جوڑا زیب تن کیا جاتا، اس کے سر پر عمامہ باندھا جاتا تھا، جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ حفظ قرآن مکمل کر کے مسجد نبوی میں تراویح سنا چکا ہے، شیخ سید جعفر فقیہ نے مجھے اس کے متعلق بڑی دلچسپ بات سنائی ہے، خصوصاً ان کے والد کی طرف سے اپنے ایک لڑکے کے جشن ختم قرآن کے متعلق۔ اسی طرح میں نے محترم شیخ محمد سعید دفتر سے اس کے کئی انداز کا ذکر سنا ہے، مکاتب میں بچوں کو قرآن حفظ کرانے کے لیے یہ جشن بڑا حوصلہ افزاء ثابت ہوا ہے، مدرسین قرأت، کتابت اور تحفیظ قرآن کی نگرانی میں خود مسجد نبوی میں کئی مکاتب قائم کیے تھے، اہل مدینہ کے بچوں کی تعلیم میں یہی مکاتب بنیاد تصور کیے جاتے تھے، اس کے بعد بچہ دروس حرم میں شریک ہوتا، یا بعد میں مدارس کا رخ کرتا تھا۔

اپنے ساتھیوں، استاذ اور والد کو تراویح میں قرآن سنانے کا بچوں کا یہ معمول برقرار تھا، اور اب بھی محدود دائرے میں باقی ہے، اس میں کم لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی نماز امام کی نماز کے بعد ہی شروع کرتے ہیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ سلسلہ دن بدن ختم ہو رہا ہے، اکا دکا دیکھائی دیتا ہے، یہ مکاتب بھی منسوخ کر دیئے گئے، مسجد نبوی کے آس پاس کچھ یادگار مکاتب باقی ہیں، لیکن وہ بچوں کے مزاج کی رعایت کرنے کے سبب تعلیم وتحفیظ کے فریضہ کی انجام دہی نہیں کر پاتے۔

پھر خود بچوں کے والدین بھی اس طرح کے مکاتب میں وقت گزاری ناپسند کرتے ہیں، اور فوراً بچوں کو مدارس میں داخل کر دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں بچوں پر مضامین کا اس قدر بوجھ پڑ جاتا ہے کہ حفظ قرآن سے قاصر رہتے ہیں، ہاں کچھ والدین اس پر خاص توجہ دیتے ہیں، یا اس خلا کو پر کرنے کے لیے وزارت تعلیم کی طرف سے قائم کردہ مدارس تحفیظ قرآن میں کچھ بچے داخل ہو جاتے ہیں، یا اہل خیر کے تعاون سے اس مقصد کی تکمیل کے لیے جمعیات قائم ہیں جن میں بہت سے شہری اور دیہاتی بچے داخلہ لیتے ہیں، مکاتب کا ذکر ضمناً آ گیا تھا، لہذا اب ابتدائی عہد سعودی میں تراویح کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

سعودی عہد

تمہید

کسی اچھوتے موضوع پر قلم اٹھانا مضمون نگار کیلئے بڑا مشکل ہوتا ہے، ہر چند کہ مضمون نگار کو اس میں پیش قدمی کا شرف مل جاتا ہے، لیکن اس کے مضمون میں ....اور تنقید کی گنجائش رہتی ہے، اس لیے اگر کتابی شکل میں مضامین موجود ہوں، تو ان کو منتخب کر کے مرتب کر دیا جائے، لیکن جس موضوع پر کتابیں نہ ہوں وہ موضوع اچھوتا ہوتا ہے، اور مضمون نگار کے زمانہ سے وابستہ نہ ہوتو اس کے لیے اس پر قلم اٹھانا حد درجہ مشکل ہوتا ہے، نہ اس کے پاس مصادر اور مآخذ ہوتے ہیں، اور نہ اپنے مشاہدہ سے استفادہ کی کچھ گنجائش رہتی ہے، بلکہ عام بات چیت سے مضمون نکالنا ہوتا ہے، اور اگر زمانہ قدیم کی بات چیت ہوتو مزید دشواری سامنے آتی ہے، کیوں کہ لوگ بھول جاتے ہیں، جس کے سبب طرح طرح کے اقوال اور مختلف اختلاف دیکھنے میں آتے ہیں اور مضمون نگار کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقصد سے متعلق مضمون کو اخذ کرنے میں اس سے غلطی ہونا، اور کمی بیشی ہونا عین ممکن ہے۔

ابتدائی سعودی عہد میں تراویح کا موضوع کچھ اس طرح کا ہے، نہ تاریخی کتابوں میں اس کا ذکر ہے، اور نہ ہی ہمارے مشاہدہ میں ہے، جس سے استنباط کیا جا سکے۔

میں نے بہت سے ان حضرات سے ملاقات کی، جنھوں نے سابقہ سعودی دور کا آخری حصہ اور اس دور کا آغاز اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ہر ایک نے اپنی اپنی یادداشت کے مطابق کم و بیش بتایا، جن سے مجموعی طور سے ایک مکمل تصویر سامنے آتی ہے، بنیادی طور پر اس میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ شکل و صورت ہر ایک کے نزدیک الگ الگ نظر آتی ہے، ان سب کا خلاصہ ہم ہدیہ قارئین کر رہے ہیں اس سے ایک اجمالی صورت معلوم ہو جائے گی۔

ہم قارئین سے اس سے قبل بھی گزارش کر چکے ہیں کہ اس موضوع سے متعلق اگر کسی کے پاس معلومات ہوں تو براہِ کرم ہم تک پہونچا دیں، تاکہ یہ موضوع تشنہ نہ رہے، اور یہ علمی خدمت مکمل ہوجائے اور تائید حق ہو سکے۔

حجاز میں سعودی دور کا آغاز:

سعودی دور اس صدی کے نصف سے قبل شروع ہوا، اور بذات خود مدینہ منورہ میں ۱۳۴۴ھ میں اس کا آغاز ہوا ہے، اس سے پہلے تراویح مختلف ائمہ اور مختلف جماعتوں میں ایک ساتھ ادا کی جاتی تھی سب لوگ ابتدائی رات ہی میں بیس رکعات پڑھ لیتے تھے، البتہ بعض حضرات خصوصاً مالکیہ رات کے اخیر حصہ میں دوبارہ آکر ۱۶؍رکعات پڑھتے تھے، جس کا ذکر آچکا ہے، سعودی دور کے آغاز کے بعد یہ تعدادِ ائمہ اور مختلف جماعت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

مدینہ منورہ میں یہ سلسلہ عارضی تھا، جو ساتویں صدی کے بعد ہی شروع ہوا، سات صدیوں تک مدینہ میں تمام نمازیں ایک ہی امام کے پیچھے ادا کی جاتی رہیں، کسی بھی جماعت کے لیے متعدد جماعتیں نہیں ہوتی تھیں بلکہ امام دار الہجرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک مسجد میں کسی نماز کے لیے متعدد جماعت مکروہ ہے۔

اس دور سے قبل مدینہ منورہ پر مختلف مسلکی حالات آئے، پہلے مالکیت کا رواج تھا، پھر شافعیت اور اس کے بعد حنفیت کا بول بالا ہوا، لیکن ایک وقت متعدد ائمہ کا رواج نہ تھا، پھر فقہی مذاہب کی اپنی اپنی آراء وافکار کی الگ الگ تعلیم کے آغاز کے بعد متعدد مذاہب مدینہ میں وجود میں آئے، بحث ومباحثہ شروع ہوا جو منافسہ اور مقابلہ کی شکل اختیار کر گیا، آخر میں پانچوں نماز کے لئے متعدد ائمہ مقرر ہو گئے۔

عہد سعودی میں مسجد نبوی اور مسجد حرام دونوں جگہوں پر عام نمازوں اور تراویح کے لئے ایک ہی جماعت ہونے لگی، اور امامت اپنی اصلی حالت پر آ گئی، جو ایک منظّم شکل تھی۔

تراویح کی تعداد کی رکعات اور اس کی ادائیگی کی شکل یہ ہوئی کہ مہینہ بھر شروع رات میں بیس رکعات اور وتر ادا کی جاتی تھیں، البتہ عشرۂ اخیر میں قیامِ لیل کے نام سے مزید

دس رکعات اور تین وتر ادا کی جاتی تھیں، اس طرح عشرۂ اخیرہ میں کل ۳۶ رکعات ہو جاتی تھی، اگر ابتدائی رات کی وتر اور اخیر شب کی وتر کو جوڑ لیا جائے، تو وہی تعداد پوری ہو جاتی ہے، جو اب تک رائج تھی، لیکن کیا یہ اتفاقاً ہو گیا تھا یا بالقصد؟

غالب گمان یہ ہے کہ ایسا بلا قصد اتفاقاً ہو گیا تھا، مقصد یہ تھا کہ عشرۂ اخیر میں زیادہ محنت ہو سکے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اخیر عشرہ میں جتنی محنت کرتے تھے، اور دنوں میں نہیں کرتے تھے، اور حضرت عائشہؓ ہی سے روایت ہے کہ جب اخیر عشرہ آتا تو رسول اللہ اپنا بستر لپیٹ دیتے تھے، اپنا تہبند مضبوطی سے باندھ لیتے، اور اہل خانہ کو جگاتے تھے۔

اس کے علاوہ اور بھی روایات ہیں، شب قدر کی تلاش میں پوری جانفشانی کرتے تھے، جس کے متعلق کثرت سے روایات آئی ہیں کہ وہ اخیر عشرہ میں ہے رسول اللہ ﷺ اخیر عشرہ میں اعتکاف کرتے تھے، بقیہ ایام میں نہیں۔

بہر کیف تراویح وہی بیس رکعات برقرار رہی، جس پر تمام شہروں کا عمل تھا، اور اس کے قائل ائمہ ثلاثہ ہیں، اور خاص طور عشرہ اخیرہ میں تہجد اور قیام لیل کے نام پر دس رکعات مزید پڑھی جاتی تھیں۔

اس دور کی نئی چیز:

سابقہ دور کے لحاظ سے تراویح کے تعلق سے اس دور میں نئی چیز ایک جماعت کا ہونا ہے، یعنی متعدد جماعتوں کو ختم کر دیا گیا، جو انتشار اور تشویش کا باعث تھا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے عظیم لطف واحسان سے ساری امت کو ایک جماعت اور ایک امام کے پیچھے تمام نمازوں کی ادائیگی پر متفق کر دیا، خواہ اس امام کا تعلق مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب سے ہو، جو کتاب وسنت کے دائرے کے اندر آتے ہیں۔

ہمیں یہاں یہ بحث نہیں کرنی ہے کہ ایک مسجد میں تعدادائمہ و جماعت کا کیا حکم ہے، کیوں کہ مسئلہ مختلف فیہ ہے جبکہ باتفاقِ ائمہ مذاہب ایک مسلک کے ماننے والے کی نماز

دوسرے مسلک والے کے پیچھے جائز ہے اور ہم یہاں مذاہب کے مابین موازنہ بھی نہیں کرنا چاہتے، کیونکہ سب کا مآخذ ایک ہی ہے، کتاب وسنت۔ ان سب چیزوں میں الجھنے کے بجائے ہمارے پیش نظر محض امت اسلامیہ کا اتحاد واتفاق ہے، خصوصاً اس جیسے عمل میں جو اتحاد کی علامت ہے، یہاں یہی اشارہ کر دینا کافی ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں مختلف جماعتوں اور ائمہ کو دیکھا تو اچھا معلوم نہ ہوا، اور سب کو متحد کر کے دیکھا تو بہت بھلا معلوم ہوا، تو انھوں نے کہا: کیا اچھی بدعت ہے یہ!

بیس رکعات پر اقتصار اس لیے کیا گیا کہ ائمہ ثلاثہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، اور احمدؒ کے یہاں مدینہ کے علاوہ میں معمول بہ یہی ہے، خود مدینہ منورہ کے تعلق سے یزید بن رومان کی روایت کو مستدل بنایا گیا ہے، اور بعض اہل مکہ کے طواف کے بالمقابل تعداد رکعات میں زیادتی پر عمل نہیں کیا گیا ہے، اس پر بحث کی جا چکی ہے۔

چوتھی صدی اور اس کے بعد امام ابوزرعہ کے دور تک اسی پر عمل رہا ہے، بتایا جا چکا ہے کہ جب امام ابوزرعہ نے اس کو پرانی شکل پر زندہ کرنا چاہا، تو ان چھتیس رکعات کو ایک ساتھ نہیں پڑھایا، بلکہ ائمہ کے اختلاف کو مدنظر رکھتے ہوئے عشاء کے بعد بیس رکعات مقرر کی تاکہ متفق علیہ پر عمل ہو سکے اور اہل مدینہ کے عمل کی رعایت میں سولہ رکعات آخری شب میں پڑھایا، وہ رمضان میں تراویح میں دو ختم کرتے تھے، ایک ختم ابتدائی رات کی بیس رکعات میں اور دوسرا ختم آخری شب کی سولہ رکعات میں، یہ دو ختم اس دور میں بھی موجود ہیں، ایک ختم ابتدائی شب کی تراویح میں ہوتا ہے، اور دوسرا ختم عشرہ اخیر کی دس راتوں میں ہوتا ہے۔

اب نتیجہ کے طور پر اس دور اور سابقہ دور میں مطابقت ہو جاتی ہے کہ دو ختم ہر ایک میں ہوئے، ہاں تعداد رکعات اور ابتدائی اخیر شب میں نمازوں کی تقسیم الگ الگ ہے۔

اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ جماعت ایک ہوگئی، گو کہ ائمہ مختلف ہیں، جو باری باری پنجگانہ نمازیں پڑھاتے ہیں، ایک نماز کے لیے متعدد جماعتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

سعودی دور کے پہلے سعودی امام مقام ''حائل'' کے شیخ حمیدی بردعان تھے۔ان کے ساتھ اورانکے بعد کئی امام مقرر کئے گئے، جواس سے پہلے ائمہ ثلاثہ کو ماننے والوں کوسابقہ شکل پرنماز پڑھاتے تھے، یہ سبھی ائمہ باری باری پنجگانہ نماز پڑھاتے تھے، لیکن الگ الگ جماعتیں نہیں تھیں۔شیخ محمد خلیل (جو پہلے شافعیہ کےامام تھے) کے ذمہ ظہر کی نماز تھی، اوروہ تمام لوگوں کونماز پڑھاتے تھے، شیخ مولود (جو پہلے مالکیہ کے امام تھے) کے ذمہ نماز عصر تھی، مغرب اورعشاء کی نماز شیخ عبدالرزاق حمزہ کے ذمہ تھی، شیخ تقی الدین ہلالی ان کے قائم مقائم ہوا کرتے تھے، اسی طرح شیخ محمد عبداللہ تنبکتی بھی نماز پڑھاتے تھے،اس کے بعد شیخ صالح زغیبی پنجگانہ اورتراویح کےامام رہے،اورتقریباً چوتھائی صدی تک (اپنی زندگی کے اخیر تک) تنہاامامت کرتے تھے، پھر کبرسنی کے سبب شیخ عبدالعزیز بن صالح ابتداء شعبان ۱۳٦۷ھ سےان کےمعاون مقرر ہوئے،اورتقریباً ۱۳۷۲ھ میں شیخ صالح زغیبی کی رحلت کے بعدتنہا شیخ عبدالعزیز امام ہوگئے، ۱۳۷٦ھ میں شیخ عبدالمجید بن حسن ان کے معاون مقرر ہوئے تادم تحریرسرکاری طور پرمسجد نبوی کی امامت شیخ عبدالعزیز بن صالح اوران کے نائب شیخ عبدالمجید بن حسن کے ذمہ ہے، ہماری خواہش تھی کہ اس دور کے ائمہ تراویح مسجد نبوی خصوصاً تراویح کے بارے میں بہت کچھ لکھا جائے لیکن بات لمبی ہو جائے گی، اور موضوع سےدور چلی جائے گی۔

تاہم ان کا ایک سرسری اورمختصر تذکرہ کردینا چاہئے، آئندہ اللہ تعالیٰ کسی کوتوفیق دے کہ وہ ان حضرات کے حالات زندگی کوتفصیل کے ساتھ مستقل طور پرتحریر کرے، جواس عظیم مسجد نبوی کی خدمت ہوگی،اوران ائمہ کاحق ادا ہوسکے گا،ابن فرحون نے اپنے دور کے کئی ائمہ مسجد نبوی کے حالات زندگی کا ذکر کیا ہے،اوران کے واقعات نقل کیے ہیں اس کے بعد مسجد نبوی کے مؤذنین اور خدام کا ذکر کیا ہے،اوراپنے دور کے لحاظ سے بہت کچھ لکھ دیا ہے، جواس بات کا غماز ہے کہ اس موضوع پر پہلے بھی لکھا جاچکا ہے، یہ مؤرخین اور مصنفین کی توجہ کا مرکز رہا ہے، خاص طور پراگر زیر بحث عملی پہلو پراورامامت کی نوعیت، قرأت کی

کیفیت اور نماز وغیرہ کا فقہی حکم ہو، کیوں کی مسجد نبوی شریف کی ہمیشہ سے ایک حیثیت اور اس کا دلوں میں ایک مقام رہا ہے، اس کو نمونہ عمل کے طور دیکھا جاتا رہا ہے۔

جب ماضی میں اس مسجد میں امامت کی ایک اہمیت کی چیز رہی ہے، تو اس وقت کی اہمیت مزید ہو جاتی ہے کیوں کہ نمازیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے، اور باہر کے لوگوں کی آمد ورفت روز افزوں ہے، اور یہی پیش نظر ہوتا ہے کہ یہاں کی امامت درجہ کمال کی ہو، اور مسجد نبوی کے شایان شان احترام وتعظیم کی مظہر ہو خصوصاً اسلئے کی یہیں رسول اللہ ﷺ اور ان کے خلفائے کرام نے کھڑے ہو کر امامت کی ہے، اور یہ نعمت ہر کس وناکس کو کہاں ملتی ہے، کوئی خوش نصیب ہی ہوتا ہے، جس کو یہ شرف حاصل ہوتا ہے، اور اسکے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ اس ذمہ داری کو انجام دیتا ہے۔

لہذا اس مسجد شریف کے ائمہ کے حقوق وواجبات بڑے نازک ہیں، اور کم از کم ان حضرات کے حالات زندگی اور امتیازات کا ذکر دیا جائے، جو دوسرے ائمہ مساجد کے لیے نمازوں کی پابندی اور امامت کے حقوق کی ادائیگی میں نمونہ عمل ہو۔

ہم ان حضرات کے سارے حقوق تو ادا نہیں کر سکتے ہیں، لیکن ان کا ایک سرسری تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے۔

عصر حاضر کے ائمہ مسجد نبوی:

شیخ حمیدی : پورا نام شیخ حمیدی بردعان ہے، ان کے متعلق بتایا جا چکا ہے کہ یہ حائل کے باشندے تھے، سعودی دور کے آغاز میں مسجد نبوی کے سب سے پہلے امام یہی ہیں، دو سال اس منصب جلیل پر فائز رہے، اس کے بعد انھوں نے شاہ عبدالعزیز سے درخواست کی کہ انھیں اپنے شہر جانے کی اجازت دی جائے، وہاں کے لوگوں کی خواہش تھی کہ شیخ اپنے شہر میں آکر تعلیم وتربیت، امامت کے فرائض انجام دیں، شاہ معظم نے تو ابتداءً انکار کیا، لیکن بالآخر اجازت دیدی، کچھ دنوں کے بعد شیخ حمیدی کی خواہش ہوئی کہ دوبارہ مدینہ منورہ میں آجائیں۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مدینہ طیبہ کا

دلوں میں کیا اثر و مقام ہے یہ دولت چھن جانے کے بعد انسان بے قرار رہتا ہے۔ شیخ تقی الدین کی موصوف کے ساتھ ایک بار گفتگو ہوئی تھی، جس کا ماحصل یہی تھا۔

شیخ مولود : موصوف مغرب (مراکش) کے باشندے تھے، سعودی دور سے قبل مدینہ طیبہ ہجرت کر کے آئے اور یہیں وفات پائی، میرے علم میں نہیں کہ انھوں نے تراویح کی امامت کی ہے۔

شیخ محمد خلیل اور **شیخ اسعد**: یہ دونوں حضرات مدینہ طیبہ کے تھے۔ شیخ اسعد نے تراویح کی امامت کرائی ہے ان دونوں حضرات نے مدینہ ہی میں وفات پائی ہے، اور نیک اولاد ان کی وارث ہوئی۔ یہ تینوں حضرات اس دور سے قبل مسجد نبوی میں اپنے اپنے مذاہب کے امام رہ چکے تھے۔

شیخ عبد الرحمٰن حمزہ: اس دور کے آغاز میں ہجرت کر کے مصر سے آئے تھے، اور دو سال سے زائد فجر و مغرب کے امام رہے، پھر مکہ مکرمہ منتقل کر دیے گئے، مدینہ واپس نہیں آئے، اور مکہ اور طائف کے درمیان رہ گئے ۱۳۷۲/۳/۲۷ھ میں معہد علمی ریاض میں حدیث واصول حدیث پڑھانے کے لئے مدعو ہوئے، پھر بالآخر طائف میں قیام پذیر ہیں، عمر دراز ہو چکے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اور ہمیں عافیت بخشے۔

شیخ تقی الدین ہلالی: ۱۳۴۱/۴۰ھ میں مراکش سے ہجرت کر کے مصر آئے، ایک سال وہیں قیام کیا، جہاں ان کی ملاقات رشید رضا مصری سے ہوئی، وہ مصر کے ساحلی اور میدانی علاقے میں اور اسکندریہ میں سلفی دعوت کی تبلیغ کرتے رہے۔

پھر اسی سال حج کے لئے مکہ مکرمہ آئے، اور تین ماہ شیخ محمد نصیف کی طرف رہے، موصوف اپنے دادا کی خدمت میں آنے والے تمام سلفیوں کے مرکز بنے رہے، پھر تعلیم اور کتب خانوں کے معائنہ کی غرض سے ہندوستان کا سفر کیا، دہلی کے ایک مدرسہ علی جان میں درس دیا، پھر ہندوستان کے مختلف مدارس کا دورہ کیا، اسی اثناء میں ترمذی کے شارح صاحب تحفة الأحوذی سے ملاقات کی، اس وقت اس شرح پر کام ہو رہا تھا، اور اس شرح کے

بارے میں انھوں نے ایک قصیدہ لکھا، جس پر طلبہ سے حدیث پر عمل پیرا ہونے اور اس شرح سے استفادہ کی اپیل کی، یہ قصیدہ مذکورہ شرح کی چوتھی جلد مطبوعہ ہندوستان کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

اس کے بعد شیخ آلوسیؒ سے ملاقات کے لیے عراق کا سفر کیا، لیکن ان سے ملاقات نہ ہو سکی، تین سال عراق میں گزارے، وہیں شادی کی اور اولاد ہوئی۔

دوبارہ ۱۳۴۵ھ میں حجاز تشریف لائے، اور شیخ رشید رضا کے یہاں تشریف لے گئے، تو شیخ نے موصوف کو ایک خط شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے نام لکھ کر دیا کہ ان کو اپنے یہاں رکھ لیں، شاہ نے ان کو مسجد نبوی کا امام مقرر کرنا چاہا، اس شرط پر رکوع وسجدہ کی تسبیحات بیس بار کہنے کی مقدار ٹھہریں، لیکن موصوف کو یہ بات بہت طویل معلوم ہوئی، لہٰذا ان کو دروس حدیث نبوی کا نگراں مقرر کر دیا گیا، اور ان کے رفیق شیخ عبدالرزاق حمزہ کو امام مقرر کر دیا گیا، لیکن شیخ حمزہ ان کو بعض نمازوں خصوصاً فجر میں اپنا نائب بنا دیا کرتے تھے، دو سال مدینہ طیبہ میں قیام رہا، پھر اس وقت کے امیر مدینہ کے ساتھ موصوف کی کچھ ان بن ہو گئی، معہد سعودی میں (جو ایک دینی سکنڈری اسکول تھا) مدرس ہو کر منتقل ہو گئے، میں نے موصوف سے سنا ہے کہ اس ان بن کی وجہ یہ تھی کہ دعوت کا طریقہ اور انکار منکر کا اسلوب کس قدر سخت یا نرم ہونا چاہیے؟ مسئلہ عقیدہ میں نرمی برتنے کے سبب اس وقت کے بعض ذمہ داران کی ہجو کی تھی، اور یہ اشعار انھوں نے مجھے لکھوائے بھی تھے، لیکن ان میں بعض حضرات کو نام بنام ذکر کیا گیا ہے، اس کا یہاں لکھنا مناسب نہیں، خصوصاً جبکہ موصوف اس دنیا میں نہیں رہے، تو اس کے لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟

قابل ذکر امر یہ ہے کہ شیخ عبدالرزاق نے بھی اسی سبب سے مکہ کا سفر کیا تھا، پھر وہاں شیخ سید ندوی کی دعوت پر ہندوستان گئے، وہاں تین سال قیام رہا، پھر عراق واپس آئے اور وہاں سے اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے لیے یورپ چلے گئے، اور اس سے قبل موصوف کو جامعہ قیروان سے ڈگری مل چکی تھی۔

وہ جنیوا آ گئے جہاں امیر شکیب ارسلان سے ملاقات ہوئی، اور ان کے توسط ''بون یونیورسٹی'' میں عربی زبان کے لکچرار مقرر ہو گیے وہیں پڑھتے بھی رہے، اور ۱۹۴۰ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

پھر مراکش کا سفر کیا، وہیں قیام کیا، جب جنگ ختم ہوگئی تو عراق آ گئے، اور بغداد یونیورسٹی میں استاذ رہے، عبدالکریم قاسم کا انقلاب برپا ہوا تو وہاں سے بھاگ کر جرمنی اور پھر وہاں سے مراکش آ گئے، اور شاہ محمد پنجم یونیورسٹی میں استاذ مقرر ہو گئے۔

پھر ان کو جامعہ اسلامیہ میں تدریس کے لیے ۱۳۸۸ھ کے آغاز میں دعوت دی گئی، اور پھر یہیں کے ہو گئے اب استاذ اور رکن انتظامیہ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ یہ میری ان سے زبانی گفتگو کا خلاصہ تھا، چونکہ اس دور کے اوائل قدیم ترین معاصرین میں ان کا شمار ہے، لہٰذا اس اہمیت کے پیش نظر ان کو قلم بند کر لیا گیا تھا۔

شیخ محمد عبد اللہ تنبکی: موصوف ''مالی'' کے علمی وسیاسی دارالحکومت ''تنبکو'' سے تعلق رکھتے تھے، ۱۳۱۸ھ میں اپنے والد گرامی عبدالقدوس انصاری، شیخ ابوبکر تنبکتی اور شیخ طیب کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آئے، اس وقت وہ پانچ سال کے تھے، مدینہ میں قیام رہا، مدرسہ دارالعلوم شرعیہ مدینہ منورہ میں تعلیم پائی، اور ۱۳۴۳، ۱۳۴۴ھ میں امام رہے۔ پھر یمن و ہندوستان کا ایک علمی سفر کیا، ۱۳۵۷ھ میں واپس آئے، بڑی سرگرمی کے ساتھ دعوت کے کام اور مدارس کے قیام میں لگ گئے، بالآخر ۱۳۷۱ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد شیخ زغیبی امام ہوئے۔

ان تمام حضرات کے بعد **شیخ صالح** کو امامت ملی تھی، وہ تنہا امام تھے، اور وہ اسی کے ہو کر رہ گئے، تقریباً ۲۵ رسال اس منصب پر فائز رہے، اور تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔

یہ قصیم کے باشندے تھے، ان کے متعلق شیخ سعید دفتر دار نے تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب اعلام المدینہ (مخطوطہ) میں لکھا ہے۔

لیکن ہمارے لئے اس میں سے وہ حصہ قابل توجہ ہے، جس کا تعلق امامت سے ہے، اور موصوف کے غرائب ونوادر جو دوسرے کے یہاں نہیں ملتے، مثلاً میں نے سنا ہے کہ شیخ عبدالعزیز بن صالح عصر کی نماز کے لیے مسجد نبوی میں تشریف لاتے، تو عشاء پڑھ کر ہی نکلتے، اور فجر کے لیے آتے تو طلوع آفتاب کے بعد ہی نکلتے۔

اسی طرح میں شیخ عبدالرحمٰن بن حصین سے سنا کہ نماز میں شیخ عبدالعزیز سے سہوشاذ ونادر ہوا ہے، نیز میں نے شیخ عبدالمجید سے سنا ہے کہ ایک بار موصوف نماز کے لیے کھڑے ہوئے پھر مڑ کر اشارہ سے کہا کہ آپ حضرات اپنی جگہوں پر رہیں، اور جا کر وضو کیا، اور واپس آکر نماز پڑھائی، اپنا نائب مقرر نہیں کیا، کیوں کہ ان کی خواہش تھی کہ مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے ان کی کوئی نماز فوت نہ ہو۔

اسی وجہ سے مشہور ہے کہ مدینہ میں رہتے ہوئے کبھی بھی کسی نماز میں غائب نہیں رہے، الا یہ کہ مریض ہوں، اور مدینہ منورہ سے صرف ایک بار نکلے، اور صرف ایک بار حج کیا۔

پُر لطف بات یہ کہ اس وقت امام حرم مکی کبھی کبھی خود کو امام حرمین کہہ دیا کرتے تھے، ایک بار امام حرم مکی مدینہ منورہ آئے تو مسجد نبوی میں کوئی ایک وقت ہی نماز پڑھانی چاہی، تاکہ اس لقب کا جواز پیدا ہو سکے، لیکن شیخ نے ایسا نہ کرنے دیا۔

مرحوم نے مجھ سے اپنا ایک عجیب وغریب واقعہ یہ بیان کیا کہ ایک روزہ وہ نماز فجر کیلئے بیدار ہوئے، ان کا معمول تھا کہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے اٹھ جایا کرتے تھے، وضو کرتے وتر پڑھتے، پھر مسجد نبوی آتے تھے، وضو کے بعد انھوں نے جوتا پہننا چاہا تو ایک بچھو نے ڈنک ماردی، اس وقت کوئی مددگار بھی نہیں تھا، جو دوالاتا، نماز پڑھانے کے لئے اپنے نائب کو اطلاع بھی نہیں دے سکتے تھے، مجبوراً اٹھے اور حرم آئے حسب عادت پہونچے اور نماز کے وقت کا انتظار کیا، نماز اذان کے بیس منٹ بعد ہوتی تھی، وقت ہو گیا نماز پڑھائی، اور وقت سے پہلے نماز شروع نہیں کیا، مبادا لوگوں کی جماعت فوت ہو جائے، اس دوران کسی کو ان کی حالت کا علم واحساس نہ ہو سکا، بالآخر نماز سے فارغ ہوئے، تو صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا

اور نڈھال ہو گئے کچھ لوگوں کو بتایا، کسی نے ان پر کچھ پڑھا، ان کو اٹھا کر ان کے گھر لایا گیا، اور بچھو کے ڈنک کا اثر ختم کرنے والی دوا دی گئی، اخیر عمر میں شیخ عبدالعزیز بن صالح ان کی نیابت کرتے تھے، اور جب ان کے لیے قرأت کرنا دشوار ہو گیا، تو جہری نمازوں اور خطبۂ جمعہ اسی طرح تراویح اور اخیر عشرہ کی نماز میں ان کے قائم مقام بن گئے۔

شیخ عبد العزیز بن صالح جو اس وقت مسجد نبوی کے امام اور خطیب ہیں، اور ان کے معاون **شیخ عبد المجید** یہ دونوں ہم عصر ہیں، اور یہیں مقیم ہیں، ان کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، تمام لوگ ان سے واقف ہیں، جو کچھ لکھا جائے گا اس سے زیادہ عام طور پر لوگ جانتے ہیں۔

تاہم نماز تراویح سے متعلق ان کے بارے میں کچھ لکھنا ہے، (جس کا تقاضا بھی ہے) گو کہ مختصر طور بہر کیف ضروری ہے۔

اول:

شیخ عبدالعزیز بن صالح: موصوف ''مجمعیہ'' میں پیدا ہوئے، ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ تھے، یہ گھر فضل و کمال میں معروف ہے، اور ''مجمعیہ'' میں اپنی ٹھوس رائے اور قابل نمونہ ہونے کے سبب خاص مقام رکھتا ہے، موصوف عزت و عظمت فضل و کمال اور جذبہ خیر کے ماحول میں پروان چڑھے، بلوغ سے قبل بچپن ہی میں قرآن حفظ کر لیا، اور پرانے مشائخ سے تعلیم حاصل کی، اور سب سے زیادہ شیخ عنقری (جو اپنے دور کے بلند پایہ عالم ہیں، اور تین جلدوں میں ''حاشیہ العنقری علی الروض المربع'' کے نام سے موصوف کی ایک تصنیف ہے) سے پڑھا، اور علم تجوید مسجد نبوی کے شیخ قراء اور اپنے دور کے امام قرأت، شیخ حسن شاعر سے بروایت حفص ۱۳۷۰ھ میں مکمل کیا۔

موصوف ابتداء ہی سے بڑے محنتی تھے، بڑی لگن سے پڑھتے تھے، ان کے یہاں تعلیم بحث و مباحثہ کے طور پر ہوتی تھی، وقت کی کوئی پابندی نہیں تھی، کتاب کا امتحان نہیں ہوتا تھا، نظام تعلیم سے قبل ہی عام طور پر تمام ممالک میں رائج تھا، جو تحصیل علم اور کمال پیدا

کرنے کا ایک وسیع میدان ہوتا تھا، بچپن ہی سے موصوف میں فضل وکمال کے آثار نمایاں تھے، چنانچہ سولہ برس کی عمر میں اپنی مسجد کے معاون امام نماز تراویح منتخب ہو گیے، اس کے بعد ''مجمعیہ'' کے امام، پھر مجلس **امر با لمعروف و نهی عن المنکر** مجمعیہ کے صدر ہوئے، تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔

اس کے بعد قضاء کی لائن میں آ گئے، اور شیخ عبداللہ بن زاحم رحمہ اللہ کے ساتھ ریاض میں ان کی تقرری ہوگئی، اوراس دوران انھوں نے ریاض کے مشائخ خصوصاً آل شیخ اور حضرت مفتی رحمہ اللہ کے ساتھ روابط قائم کیے۔ ۱۳۶۳ھ میں شاہ عبدالعزیز نے شیخ عبداللہ بن مزاحم کو (جو کہ شاہ کے مقربین میں سے تھے) مدینہ منورہ کی عدالت کے لئے صدر منتخب کردیا۔

نیز شیخ عبدالعزیز بن صالح کو بھی انھوں نے موصوف کی رفاقت کیلئے مدینہ کی عدالت میں مقرر کردیا۔ موصوف نے شعبان ۱۳۶۷ھ میں شیخ صالح زغیبی کے معاون کی حیثیت سے مسجد نبوی کی امامت اور خطبہ جمعہ کا آغاز کیا۔

پھر خاص طور پر جہری نمازوں میں اوراس کے بعد تمام نمازوں میں ان کے معاون ہو گئے۔ ۱۳۷۰ھ میں شیخ صالح انتقال کر گیے تو امامت وخطابت شیخ عبدالعزیز کے سپرد ہوگئی، اسی کے ساتھ وہ سرکاری طور پر ہائی کورٹ میں بھی کام کرتے رہے، اس وقت وہ معاون صدر تھے، نیز مسجد نبوی پھر اپنے گھر فقہ وفرائض کے درس دیتے تھے۔ ۱۲/رجب ۱۳۷۴ھ کو صدر عدالت شیخ عبداللہ کا انتقال ہوگیا، تو شیخ عبدالعزیز بن صالح اس کے صدر بن گیے اور اس تاریخ سے موصوف مسجد نبوی کے امام وخطیب اور صدر المدرسین ہیں، اسی کے ساتھ علاقہ کی عدالتوں اور دینی اداروں کے صدر ہیں، قاضیوں کی مخصوص کھیپ والا نظام آنے کے بعد موصوف محکمہ تمیز (ہائی کورٹ) کے جج کے مرتبہ پر فائز ہوئے، اور قضاء کی مجلس اعلیٰ کے ممبر بنائے گئے، اور مجلس کا کام پورے ملک کی عدالتی پنچ کی نگرانی ہے۔

یہ ساری چیزیں موصوف سے واقف حضرات کیلئے معلوم ہیں، یہاں ان کے ذکر کا

مقصد یہ ہے کہ مسجد نبوی کی امامت کی حیثیت واضح کردی جائے ،اور یہ بتادیا جائے کہ یہ بہت اہم اور نازک منصب ہے، یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ موصوف نے خطبۂ جمعہ میں معاشرتی مشکلات ومسائل پرغور وفکر کیا، ان کا تجزیہ کیا، اوران کا علاج و مداوا پیش کیا، اور لکھے ہوئے خطبوں سے ہٹ کر حالات حاضرہ کو اپنا موضوع بنایا۔

جہاں تک تراویح کا مسئلہ ہے، جواس کتاب کا موضوع ہے، تواس کی صورت، اس کی ادائیگی کی کیفیت، اس میں قرآن کی تلاوت وسکون، تو یہ درحقیقت حد درجہ اوسط ہوتی تھی، نہ تو بہت لمبی کہ ضرورت مند لوگوں کو گراں معلوم ہو، اور نہ ہی اتنی مختصر کہ عبادت کے شائقین تشنہ رہ جائیں، بلکہ ٹھہرٹھہر کر پڑھتے تھے، لیکن طوالت نہیں تھی، ہلکی قرأت کرتے، لیکن حروف کو بدلنے سے گریز کرتے تھے، خود موصوف اوران کے نائب عبدالمجید بن حسن کا یہی حال تھا۔

یہ محدود زاویہ سے تاریخی تسلسل کا بیان ہے، ان حضرات کی مکمل سوانح حیات لکھنا، مقصود نہیں کیوں کہ ان کے لئے مقدمات اور نتائج لکھنے کی ضرورت پڑتی ہے، اور یہاں ان کے بیان کی گنجائش نہیں، پھر تعارف تو ان لوگوں کا کرایا جاتا ہے جو مجہول ہوں، یہ حضرات جس کو دور ونزدیک کا ہر شخص جانتا ہے، اوراس عظیم منصب کا یہی تقاضا بھی ہے، اللہ تعالیٰ ان حضرات کو اس عظیم منصب کی خدمت کے لیے ان کی زندگی میں برکت دے۔

رہے شیخ عبدالمجید بن حسن تو انھوں نے اولاً اپنے ملک میں تعلیم کا آغاز کیا، پھر مدرسہ دارالعلوم شرعیہ میں تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھا، اس وقت یہ مدرسہ اپنے شباب پر تھا، اس میں دینی وعربی علوم کے لیے ایک عالی شعبہ قائم تھا، موصوف نے مسجد نبوی کے چند مشائخ سے بھی مثلاً شیخ طیبؒ سے دینی عربی علوم کی تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلیم کے لئے انتخاب ہوا، اوراس وقت کے ادارہ تعلیم میں شامل ہوگیے، ۱۳۶۰ھ میں مدرسہ شقراء کے بانی یہی ہیں، اوراس کو بڑی خوبی سے چلایا، مدرسہ کے منسوبین پر خصوصاً اور شہر کے باشندوں پر عموماً موصوف کا بڑا اثر تھا۔ ۱۳۶۰ھ میں قضاء کی لائن میں آگئے، اور رابغ کی عدالت میں قاضی

مقرر ہوئے۔ اور ۱۳۷۱ھ چھ سال تک اس پر مامور رہے، ۱۳۷۱ھ کے اوائل میں محکمہ مدینہ منورہ میں منتقل کر دیئے گئے، پھر صدر محکمہ شیخ عبداللہ بن زاحم کے معاون دوم مقرر ہوئے، جبکہ شیخ عبدالعزیز بن صالح معاون اول تھے۔

۱۳۷۳ھ میں موصوف نے شیخ عبدالعزیز بن صالح کے معاون کی حیثیت سے مسجد نبوی کی امامت شروع کی، اور موصوف اس وقت معاون اول کی حیثیت سے پنجگانہ نمازوں اور خطبۂ جمعہ میں امام صاحب کی عدم موجودگی میں ان کی نیابت کرتے ہیں، اور تراویح اور تہجد کی نماز ان کے ساتھ مل کر پڑھاتے ہیں، جیسا کہ اس کی شکل آئے گی۔

۱۳۹۰ھ میں (جس وقت کہ یہ کتاب لکھی جارہی ہے) مغربی علاقہ کی ہائی کورٹ کے رکن مقرر ہوئے، اور علمی بورڈ کے مندوب بنے۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ یہاں پر ان حضرات کی سوانح حیات نہیں لکھی جارہی ہے کہ ان کے خصوصیات وامتیازات گن گن کر بیان کیے جائیں، اور بہت سی چیزیں جن کو ان حضرات سے وابستہ بعض لوگ بخوبی جانتے ہیں، یا میں خود جانتا ہوں، یا ان میں سے ہر ایک دوسرے کے بارے میں جانتا ہے، کیوں کہ ان کے درمیان اشتراک عمل سے زیادہ آپسی دوستی، محبت اور اخوت قائم ہے، اور یہ چیز روز اول ہی سے ہے، جب سے ان دونوں نے یہ خدمت شروع کی۔

بہر کیف ان حضرات کا ہم عصر ہونا ہی کافی ہے، ان کے متعلق مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، جو کچھ لکھا جائے گا، لوگ اس سے زیادہ واقف ہیں، بس اللہ تعالیٰ ان دونوں حضرات کی عمر میں برکت دے۔ آمین۔

موجودہ عہد میں مسجد نبوی میں تراویح:

یہاں کے لوگوں کو تراویح کے بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں، ہاں جن کو مدینہ منورہ میں رمضان کا کوئی حصہ گزارنا نصیب نہیں ہوا، بلا شبہ وہ لوگ مسجد نبوی کی ہر چیز کے لئے بے قرار رہتے ہیں، خصوصاً تراویح جیسے مقدس عمل کے لئے جو مسجد نبوی میں ہو،

کما حقہ اس کی منظر کشی کون کرسکتا ہے؟ ہماری کوشش صرف یہ ہوگی کہ اپنے مشاہدات قلم بند کریں، یہ تو معلوم ہی ہے کہ تحریر مشاہدہ کے برابر نہیں ہوسکتی ہے، تحریر دیکھنے میں آنکھ کی طرح نہیں، اور نہ ہی سننے میں کان کی طرح ہے، تاہم حتی الامکان کوشش کریں گے۔

اولاً: وقت تراویح:

معلوم ہے کہ تراویح کا وقت عشاء کے بعد ہے، عام دنوں میں عشاء کیلئے اذان غروب سے ڈیڑھ گھنٹہ بعد ہوتی ہے، اور اذان کے بعد پندرہ منٹ بعد جماعت ہوتی ہے۔

رمضان میں عشاء کا وقت:

رمضان میں عشاء کی اذان غروب کے دو گھنٹہ بعد ہوا کرتی ہے، تا کہ جو حضرات مسجد نبوی میں افطار کرتے اور چند کھجوروں پر اکتفاء کرتے ہیں، اور نماز مغرب کے بعد گھر لوٹ کر کھانا کھاتے ہیں، اور پھر مسجد نبوی میں تراویح اور عشاء کے لئے لوٹتے ہیں، ان کے لیے سہولت ہو۔

بہت سے حضرات بڑی دور دراز سے آتے ہیں، لہٰذا ان کی سہولت اوران کی حالت کی رعایت رکھی گئی، دو گھنٹے کے بعد اذان ہوتی ہے، اور اس کے دس منٹ بعد جماعت شروع ہوجاتی ہے، نماز شیخ عبدالعزیز پڑھاتے ہیں۔ اس کے بعد جس کا جی چاہتا ہے، عشاء کی دو رکعات سنت پڑھ لیتا ہے، پھر حسب ذیل طریقہ پر تراویح شروع ہوتی ہے۔

نماز تراویح کیسے؟

غروب سے تقریباً دو گھنٹہ پچیس منٹ بعد تراویح شروع ہوتی ہے، پہلے شیخ عبد العزیز دس رکعات پانچ سلام سے پڑھتے ہیں جو (غروب کے بعد) دو گھنٹہ پچپن منٹ بعد تک جاری رہتی ہے، یعنی تقریباً آدھا گھنٹہ لگتا ہے، اس کے بعد فوراً شیخ عبدالمجید دس رکعات پانچ سلام سے پڑھانا شروع کر دیتے ہیں، جو تین بج کر پچیس منٹ (باعتبار غروب) پر پوری ہوتی ہے، اس کے بعد تین رکعات وتر (دو رکعت پھر ایک رکعت الگ الگ پڑھاتے

ہیں) جو ساڑھے تین بجے ٹھیک پوری ہوتی ہے، مجموعی طور پر دونوں حضرات مل کر مکمل ایک پارہ پڑھاتے ہیں، قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ دونوں حضرات برابر وقت میں (ہر ایک نصف پارہ نصف گھنٹے میں) ادا کرتے ہیں، اس طرح پوری بیس رکعات میں ایک پارہ مکمل ہوتا ہے، اور ایک گھنٹہ لگتا ہے۔

ہر رات کا یہی معمول ہے، صرف ۲۹ ویں شب کو کچھ الگ نوعیت ہوتی ہے، جیسا کہ آئے گا۔

مسجد نبوی میں تراویح کیلئے لوگ بڑی دلچسپی اور خواہش رکھتے ہیں، اطراف مدینہ اور باہر کے لوگوں کی اس قدر بھیڑ ہوتی ہے کہ جمعہ کی نماز کا سماں بدھ جاتا ہے، ۲۹ ویں شب کو یہ بھیڑ اور زیادہ ہو جاتی ہے، کیوں کہ اس میں ختم قرآن کریم اور دعا ہوتی ہے۔

عصر حاضر میں رمضان میں وتر:

اخیر عشرہ سے قبل راتوں میں شیخ عبدالمجید تراویح کی بیس رکعات مکمل کرنے کے بعد تین رکعات وتر پڑھاتے ہیں، دو رکعات پر سلام پھیر کر ایک رکعت الگ سے پڑھتے ہیں اور رکوع سے اٹھنے کے بعد دعا قنوت بلند آواز سے پڑھتے ہیں، البتہ اخیر عشرہ میں جب کہ اخیر رات میں تہجد کی نماز ہوتی ہے، تو وتر کی نوعیت کچھ اس طرح ہوتی ہے:

امام صاحب اور ان کے نائب تراویح کے ساتھ وتر پڑھانے کے بجائے اخیر شب میں تہجد کے بعد پڑھاتے ہیں، اس لئے کہ فرمان نبوی ہے تم رات کی نماز میں آخری نماز وتر کی نماز رکھو"

شروع رات میں وتر نہیں ادا کرتے، کیوں کہ فرمان نبوی ہے:

"ایک رات میں دو وتر نہیں۔"

چنانچہ ابتدائی شب میں شیخ محمد علی سابقہ طریقہ پر وتر پڑھاتے ہیں، عام نمازوں کا طریقہ یہی ہے، البتہ احناف پورے ماہ امام کے ساتھ نماز وتر پڑھنے کے بجائے انفرادی طور پر ادا کرتے ہیں، اور پیش امام یا نائب امام کے وتر سے فارغ ہونے کے بعد پڑھتے

ہیں، مغرب کی طرح ایک ساتھ تین رکعات ادا کرتے ہیں، ان شاء اللہ کتاب کے اخیر میں اخیر عشرہ میں تہجد کا طریقہ ذکر کرنے کے بعد احناف کے یہاں وتر کے مسئلہ میں بحث کی جائے گی، شاید یہاں بہتر ہوگا کہ رمضان کی وتر میں دعاء قنوت اس میں کبھی کبھی کمی بیشی کے ساتھ ذکر کر دیا جائے، ۳۰ رمضان ۱۳۹۰ھ کی رات میں جو وتر میں قنوت پڑھا گیا وہ حرف بہ حرف یہ ہے:

شیخ عبدالعزیز نے اس رات کو یہ دعائے قنوت پڑھی تھی۔

اللّٰھم اھدنا فیمن ھدیت و عا فنا فیمن عا فیت وتولنا فیمن تو لیت وبا رک لنا فیما اعطیت وقنا واصرف عنا شر ما قضیت فانک تقضی ولا یقضیٰ علیک انہ لا یضل من والیت ولایعز من عادیت تبارکت ربنا و تعالیت اللّٰھم اقسم لنا من خشیتک ما تحول بہٖ بیننا بین معصیتک و من طاعتک ما تبلغنا بہٖ جنتک ومن الیقین ما تھون بہ علینا مصا ئب الدنیا .اللّٰھم متعنا باسما عنا و ابصا رنا و قواتنا ما احییتنا واجعلہ الوا رث منا واجعل ثارناعلیٰ ظلمنا و انصرنا علیٰ من عا دا نا ولا تجعل مصیبتنا فی دیننا ولا تجعل الدنیااکبر ھمنا ولا مبلغ علمنا ولا تسلط علینا بذنوبنا من لا یر حمنا .

اللّٰھم اجعل خیر اعمالنا اواخرھا ،وخیر اعما لنا خواتمنا وخیر ایامنا یوم نلقاک . اللّٰھم انا نسا لک موجبا ت رحمتک وعزائم مغفرتک والسلامۃ من کل اثم والغنیمۃ من کل بر والفوز بالجنۃ و النجاۃ من النا ر نسا لک الجنۃ وما قرب الیھا من قول و عمل ونسلک ان تجعل کل قضاء قضیتہ لنا خیراً یا رب العالمین.

اللّٰھم اعطنا ولا تحرمنا و زدنا ولا تنقصنا و اکرمنا ولاتھنا ولا تحمل علینا وارزقنا و ارض عنا .

اللّٰھم انک عفو تحب العفو فا عف عنا اللّٰھم اجعل مجتمعنا ھذامجتمعاًمرحو ما واجعل ترفقنا بعده تفر قا معصوما ًولا تجعل فینا ولا منا ولا معنا شقیاولا محروما اللّٰھم انصر دینک و کتا بک وعبادک المومنین اللّٰھم انا نعوذ برضا ک من سخطک وبعفوک من عقو بتک و بک منک ،لا نحصی ثنا ء علیک انت کما اثنیت علیٰ نفسک ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم و تب علینا انک انت التواب الرحیم و صل اللّٰھم علیٰ سیدنا محمد و سلم .

اخیر رات میں قیام لیل:

بتایا جا چکا ہے کہ ابو زرعہ کے دور سے اہل مدینہ کا معمول رہا ہے کہ تراویح سے فراغت کے بعد اخیر تہائی شب میں دوبارہ مسجد نبوی میں آتے'' تا کہ سولہ رکعات ادا کر سکیں اور یہ معمول پورے رمضان کا تھا، ان سولہ رکعات کی ادائیگی کے لئے منارہ سے اعلان ہوتا تھا کہ تا کہ لوگ جمع ہو جائیں، ان سولہ رکعات اور ابتدائی رات کی بیس رکعات کو ملا کر کل تراویح چھتیس رکعات ہوتی تھی، جیسا کہ گذرا۔

لیکن اس دور میں ابتدائی مہینہ میں اخیر رات میں کوئی نماز نہیں پڑھی جاتی تھی، ہاں اخیر عشرہ آتے ہی یعنی بیسویں کی شب سے اخیر تہائی شب میں لوگ دوبارہ مسجد نبوی میں آتے ہیں، لیکن اس کے لیے اعلان نہیں ہوتا ہے، امام اور نائب امام بھی موجود ہوتے ہیں، اوراطراف مدینہ کے مرد عورتیں بوڑھے اور نوجوان لوگوں کی ایک بھیڑ لگ جاتی ہے۔ ان کی پیشانی پر خیر وخوبی، وقار اور سحر گاہی کا نور ہوتا ہے۔

امام صاحب روضہ شریف میں محراب نبوی میں کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے ہیں، نماز شروع ہوتے ہی وہ سکون، وہ جاہ وجلال اور رغبت وخوف کا منظر سامنے آتا ہے، جو ناقابل بیان ہے۔ ذہن پر مسجد نبوی کے ماضی کا روشن دور اور روضۂ اطہر کے معطر آثار نقش ہو جاتے ہیں، دور ماضی کے نمازیوں کی منور صورتیں نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں، احساس و

شعور کا وہ سلسلہ اسلاف سے مربوط ہو جاتا ہے، رحمت خداوندی کے تر جھونکے خشک دلوں کو سیراب کر دیتے ہیں، ان میں زندگی کی روح پھونک دیتے ہیں احساس وشعور اور دل و ماغ پر پوری طرح سے چھا جاتے ہیں۔

امام صاحب قرأت وترتیل کے ساتھ جب پڑھنا شروع کرتے ہیں، تو ذہن و دماغ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، اور اس تیزی سے وقت گزر جاتا ہے کہ احساس نہیں رہتا، اور کیوں نہ ہو کہ یہی زندگی کے سب سے قیمتی لمحات اور عمر کے عظیم ترین وقفے ہیں، امام صاحب دو رکعات پھر ان کے نائب دو رکعات پڑھاتے ہیں، اسی طرح باری باری دس رکعات پانچ سلام کے ذریعہ ادا کی جاتی ہے، شروع اور اخیر میں امام صاحب ہی پڑھاتے ہیں، دیر تک قنوت پڑھتے ہیں، اسی طرح نوراتوں میں ہوتا ہے۔

جب اخیر رات یعنی ۲۹ ویں شب ہوتی ہے، اور اسی میں ختم قرآن ہوتا ہے، تو اس میں نماز کچھ اس طرح ہوتی ہے:

اولاً: تراویح میں پہلے ختم پڑھا جاتا، اس وقت امام صاحب جزو (عم) تک پہونچ چکے ہوتے ہیں، اور اس رات میں بیس رکعات پڑھاتے ہیں، جب اخیر رکعت میں سورہ (**قل اعوذ برب الناس**) پڑھ لیتے تو رکوع سے پہلے ختم قرآن کی دعا پڑھتے ہیں، اور دیر تک گریہ وزاری کے ساتھ دعا ہوتی ہے، جیسے امام صاحب کی دعا میں رقت آتی ہے، لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں، مسجد میں آواز بلند ہو جاتی ہے۔ امام صاحب دعا ختم کر کے رکوع کرتے ہیں، اور رکعت مکمل کرنے کے بعد نماز وتر شیخ علمی کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔

اخیر شب میں تہجد میں مسجد بھر جاتی ہے، دھونی دی جاتی ہے، اس رات تک جز (**قد سمع**) تک پہونچ چکے ہوتے ہیں، اب حسب عادت امام صاحب نماز شروع کرتے ہیں، ان کے نائب بھی باری باری پڑھاتے ہیں، البتہ اخیر کی دو رکعات خود امام صاحب پڑھاتے ہیں جیسا کہ گزرا، اور اخیر رکعت میں سورہ (الناس) پڑھ کر ہاتھ اٹھاتے ہیں، اور حسب سابق دعا پڑھتے ہیں، اس سے فارغ ہونے کے بعد نماز مکمل کرتے ہیں، پھر وتر و

قنوت پڑھتے ہیں۔

مسجد نبوی میں اس ختم کی بڑی حیثیت، بڑی رونق اور بڑا اثر ہے، لہٰذا تفصیل کے ساتھ اس کے ثبوت کے بارے میں علماء کے اقوال، اس کی دعا، اس کے طریقہ نماز کے کس حصہ میں ہوا، اور خصوصاً مسجد نبوی کے تعلق سے بیان کیا جا رہا ہے۔

عصر حاضر ۱۳۹۰ھ میں مسجد نبوی میں ختم قرآن اور اس کے دلائل:

مدینہ منورہ اور خود مسجد نبوی میں ختم قرآن کا ہونا اور وہ بھی وہاں کے امام صاحب کے ذریعہ، اس کی عالم اسلام کے ہر حصہ میں بڑی اہمیت وحیثیت ہے، پہلے امام مالکؒ کے نزدیک اہل مدینہ کا عمل حجت ہوتا تھا، کیوں کہ یہی لوگ سلف کے وارث ہیں، مدینہ ہی سنت نبوی کا سرچشمہ ہے، اسی طرح آج بھی مدینہ منورہ کی دلوں میں ایک حیثیت، عظمت اور فوقیت ہے کہ یہی آپ ﷺ کی ہجرت گاہ اور شریعت کا وطن ہے۔

مسجد نبوی میں تراویح اور تہجد کی نماز میں ختم قرآن ہونے کی خبر سارے عالم میں پھیل چکی ہے، اور اس کے لیے بڑی تعداد یہاں آتی ہے، لہٰذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی اصل کیا ہے؟ خصوصاً ان لوگوں کی طرف سے جو ہر کام کے لیے دلیل ڈھونڈھتے ہیں، عبداللہ بن احمد بن حنبل نے اپنے والد سے سوال کیا تھا کہ اس ختم قرآن کیا ثبوت کیا ہے؟ تو امام احمد نے اس کا جو، جواب دیا وہ آئے گا۔

یہ کتاب لکھنے سے قبل حدیث کے تئیں غیرت مند اور بدعت کے سخت مخالف صاحب نے اسکے بارے میں مجھ سے دریافت کیا تھا، ان کو اس میں دو لحاظ سے شبہ تھا:

اول: حضور ﷺ نے اس کو نہیں کیا، کیوں کہ آپ نے رمضان میں مکمل تراویح نہیں پڑھی، اور پورا قرآن تراویح یا تہجد میں نہیں پڑھا، اور نہ یہ دعا پڑھی، اور اس کی گنجائش بھی نہیں، کیوں کہ آپ نے ختم قرآن کیا ہی نہیں جس کے بعد یہ دعا ہوتی ہے، تو پھر اس ختم قرآن کی مشروعیت وثبوت کیا ہے؟

دوم: لوگ پورے مہینہ قرآن کریم نہایت سکون وقار کے ساتھ خاموشی سے سنتے

ہیں ،لیکن ختم قرآن کی دعا کے وقت آہ و بکاہ اور چیخ و پکار کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ، موصوف کا کہنا ہے کہ آخرایسا کیوں ہوتا ہے،کلام الٰہی سے زیادہ دعا کی تاثیرنہیں ہوسکتی ہے؟

موصوف نے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار میرے سامنے اسی انداز سے کیا،شاید وہ اس چیز میں شریک یا حاضرنہیں رہتے ،لہٰذا بہتر یہی سمجھا گیا کہ اسی انداز سے ان کو جواب دیا جائے ،اوراپنے علم کے مطابق اسلاف سے منقول ادلہ پیش کیے جائیں ،خواہ مرفوع منقول ہوں یا موقوف، عام ہوں یا خاص،جس سے ان شاء اللہ طبیعت میں سکون اور دل میں اطمینان پیدا ہو جائے گا۔

دلائل:

مجمع الزوائد(۱۷۲/۱) میں حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا: جس نے فرض نماز پڑھی ،اس کے لیے ایک دعا مقبول ہے، اورجس نے قرآن ختم کیااس کے لئے ایک مقبول دعا ہے۔''اس کوطبرانی نے روایت کیا ہے، اس کی سند میں سلیمان راوی ہے جوضعیف ہے،حضرت ثابت سے مروی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ ختم قرآن کرتے تواپنے اہل وعیال کوجمع کرتے تھے،اوران کے لیے دعا کرتے تھے، اس کوطبرانی نے روایت کیا ہے۔اس کے رجال ثقہ ہیں،یہی روایت سنن دارمی میں حضرت ثابت ہی کے واسطے سے ہے رات میں جب وہ قرآن کریم ختم کرنے والے ہوتے تو کچھ حصہ چھوڑ دیتے تھے ،صبح کو اپنے اہل وعیال کو جمع کر کے ان کے ساتھ ختم کرتے تھے''۔یہاں پر یہ روایت مرفوع ہے،لیکن اس کی اسنادضعیف ہےایک صحابی پرموقوف اثر ہےجس کے رجال ثقہ ہیں،لہٰذاایک دوسرے کوتقویت ملے گی،شیخ حسنین مخلوف کے رسالہ میں ہے:''ختم قرآن کے بعددعامسنون ہے''۔

اس کےتحت موصوف نے حضرت عرباض کی سابقہ حدیث درج کی ہے،اورفرمایا: اس کوطبرانی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے:''جس نے قرآن پڑھا،اللہ کی حمد

کی، رسول ﷺ پر درود بھیجا، اور استغفار کیا، اس نے اس کی جگہ ہر خیر کو طلب کر لیا۔'' اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے، وہ ختم قرآن کے وقت اپنے گھر والوں کو جمع کر کے دعا کرتے تھے۔ سنن دارمی میں حضرت ابو قلابہ کی مرفوع روایت ہے: جس نے قرآن کے آغاز کے وقت شرکت کی، اس نے اللہ کے راستے میں فتح میں شرکت کی، جس نے ختم قرآن میں شرکت کی، اس نے غنیمت تقسیم ہوتے وقت شرکت کی۔''

ہمارے سامنے حضرت عرباض کی حدیث ہے، (جس کو طبرانی وغیرہ نے روایت کیا ہے) نیز ایک موقوف اثر اور ایک مرفوع روایت بیہقی میں نیز صحابی کے عمل سے تائید شدہ اثر ہے، جس کو مرفوعاً روایت کیا ہے۔ یہ ساری چیزیں ہمارے سامنے ہیں۔

مروزی کی کتاب قیام اللیل میں ہے: ''ایک شخص مسجد نبوی میں شروع سے اخیر تک قرآن پڑھتے تھے، حضرت ابن عباسؓ نے ان کے پاس ایک صاحب کو مقرر کر رکھا تھا، جب وہ قرآن ختم کرنے والے ہوتے تھے تو حضرت عباس مجلس والوں سے فرماتے اٹھو چلو ختم قرآن میں شریک ہو جائیں۔

مجاہد نے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا ختم قرآن کے وقت رحمت نازل ہوتی ہے، لوگ ختم قرآن کے وقت جمع ہوتے اور کہتے تھے: رحمت نازل ہو رہی ہے۔

سنن دارمی میں حمید اعرج سے منقول ہے: ''جس نے قرآن پڑھ کر دعا کی اس کی دعا پر چار ہزار فرشتے آمین کہتے ہیں۔

یہ ختم قرآن کے بعد دعا کے تعلق سے عمومی نصوص ہیں، ان میں نماز ہونے نہ ہونے کی کوئی قید نہیں، ابن قدامہ کے یہاں امام احمدؒ کے اس عمل کے تعلق سے مکمل تفصیل ملتی ہے، ابن قدامہ نے المغنی (۲/۱۷۱) میں لکھا ہے: فصل ختم قرآن میں۔ فضل بن زیاد نے کہا: میں نے ابوعبداللہ سے دریافت کیا: ختم قرآن کو وتر میں رکھوں یا تراویح میں؟ فرمایا تراویح میں رکھو تاکہ ہم دونوں کے دوران دعا کر سکیں۔ میں نے عرض کیا کیسے کروں: فرمایا کہ جب پورا قرآن پڑھ لو تو رکوع سے قبل اپنے ہاتھوں کو اٹھاؤ اور دعا کرو اس وقت ہم نماز

ہی میں رہیں گے دیر تک کھڑے رہو، میں نے عرض کیا کیا دعا پڑھوں؟ فرمایا جو دعا چاہے پڑھو۔ فضل نے کہا: میں نے کہنے کے مطابق عمل کیا امام احمد میرے پیچھے کھڑے ہاتھ اٹھائے دعا کررہے تھے،

امام احمدؒ کے اس قول سے بالتفصیل معلوم ہوگیا کہ ختم قرآن کا طریقہ کیا ہے، دعا کب ہوگی، اور اس میں کوئی بھی دعا پڑھی جاسکتی ہے۔

حنبل سے صراحتاً منقول ہے: میں نے امام احمدؒ کو ختم قرآن کے تعلق سے یہ فرماتے سنا، جب تم (قل أعوذ برب الناس) پڑھ لوتو رکوع سے قبل ہاتھ اٹھا کر دعا کرو۔ میں نے عرض کیا آپ کے پاس اس کی دلیل وسند کیا ہے؟ فرمایا میں نے اہل مکہ کو اسی طرح دعا کرتے دیکھا ہے، سفیان بن عیینہ ان کو مکہ میں اسی طرح دعا کراتے تھے۔ عباس بن عبد العظیم نے کہا: ہم نے بصرہ اور مکہ میں لوگوں کو اسی طرح کرتے پایا اہل مدینہ اس سلسلہ میں جو کچھ نقل کرتے ہیں حضرت عثمان بن عفانؓ سے مروی ہے۔

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ فضل بن زیاد کا امام احمدؒ سے سوال ختم کے وقت دعا کی مشروعیت کے بارے میں نہیں بلکہ نماز میں یہ دعا کہاں کرنی چاہیے، اور کس طرح؟ اس کا سوال تھا، اور امام احمدؒ نے اس کی توثیق کرتے ہوئے انہیں اس کی جگہ اور طریقہ بتایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عمل کی مشروعیت دونوں کے علم میں تھی، اس سے پہلے اس مسئلہ پر حنبل اور امام احمد کے درمیان سوال وجواب ہوا تھا، چنانچہ حنبل نے ان سے دریافت کیا تھا: آپ کے پاس اس کی سند کیا ہے؟ دلیل کیا ہے؟

امام احمدؒ نے جوان کو حوالہ دیا وہ اہل مکہ کا ان کا اپنا دیکھا سنا عمل تھا، خود امام جلیل سفیان بن عیینہ کے ساتھ اہل مکہ کے ساتھ یہ دعا پڑھانا، اہل مدینہ کی روایت، اور تین بڑے شہروں مکہ، مدینہ اور بصرہ کا معمول تھا۔ یہی شہر اس وقت علم کے گڑھ، اور قابل نمونہ تھے۔ اسی کے ساتھ اہل مدینہ کے یہاں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت موجود تھی، نیز ابن عباس کا معمول، یہ ساری چیزیں ختم قرآن کے بعد دعا کی مشروعیت کی سند ودلیل

ہیں، خواہ علی الاطلاق ہو یا تراویح میں مع بیان کیفیت، جیسا کہ امام احمدؒ سے مروی ہے۔

مجموعی لحاظ سے یہ ساری چیزیں۔اس طرح کے عمل کے لیے کافی ہے، کیوں کہ جو چیز اصل کے لحاظ سے مشروع ہوتی ہے وہ ''وصف'' کے ساتھ جائز ہوتی ہے، اصل دعا مشروع ہے، اور اس کا ختم قرآن کے ساتھ ہونا، اس کی مشروعیت کے منافی نہیں، اور یہی حکم نماز میں دعا قنوت کا ہے۔

بہرکیف سلف کی سابقہ تصریحات سے اس عمل کی مشروعیت پر ایک طرح کا سکون واطمینان پیدا ہوتا ہے، اور یہ کہ اس تینوں شہروں: بصرہ، مکہ اور مدینہ کے اسلاف کے نقش قدم کی پیروی ہے۔

جہاں تک تلاوت کے مقابلہ میں دعا سے زیادہ موثر ہونے کا مسئلہ ہے، تو پورے رمضان قرآن سکون واطمینان کے ساتھ سننے اور ختم قرآن کی دعا آہ وبکاہ کے ساتھ سننے کے درمیان مصلیوں کی حالت کے مابین موازنہ کرنا ہے، اور یہ دونوں الگ الگ حالات ہیں۔

بظاہر یہ دونوں الگ الگ ہونے کے باوجود معنیٰ اور حقیقت کے لحاظ سے متحد ہیں، اس لیے کہ تلاوت کا ادب یہ ہے کہ غور سے سنا جائے، اور دعا کی خصوصیت یہ ہے کہ خشوع وگریہ زاری ہو۔

بعض جگہوں پر دعا ہی ہوتی ہے، تلاوت نہیں۔مثلاً حالت سجدہ جس کے دوران بندہ اللہ سے قریب تر ہوتا ہے، لیکن اس قرب کے باوجود سجدہ میں تلاوت قرآن ناجائز ہے، بلکہ خوب دعا کرنی چاہیے۔

اسی طرح مخصوص حالات کی دعائیں، مثلاً صبح وشام مسجد میں داخلہ کی دعا نماز میں دعاء قنوت۔جس طرح تلاوت کے کچھ آداب ہیں، اسی طرح قرآن کے بھی کچھ مقامات ہیں۔ کہیں وعظ ونصیحت ہے، تو کہیں واقعات ہیں، تو کہیں شرعی حکم حلال وحرام کا ذکر ہے، جس کے سبب سننے والے کا ذہن ایک مفہوم سے دوسرے مفہوم کی طرح منتقل ہوتا رہتا ہے۔

جب کہ دعا میں دعا کرنے والے اور سننے والے کے احساسات، افکار وشعور اور دل ایک خاص جہت میں مرکوز ہوتے ہیں، یعنی گریہ وزاری، انابت الی اللہ کی طرف۔

بلکہ انسان فطری طور پر سخت مجبوری اور خوف کے عالم میں خالص دعا و درخواست ہی کا سہارا لیتا ہے، جیسا کہ فرمان نبوی: **الدعا مخ العبا ۃ** (دعا اصل عبادت ہے)

کون نہیں جانتا کہ جنگ بدر کے موقعہ پر جب اہل حق کی ایک مختصر جماعت اہل باطل کی بھاری جمعیت سے ٹکرائی تو اس موقعہ پر رسول اللہ ﷺ نے دعا کا سہارا لیا اور بڑی عاجزی وگریہ وزاری سے اللہ سے دعا کی حتیٰ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آپ پر رحم آ گیا، اور فرمایا: ''بس اب رہنے دیں، پروردگار نے آپ کی درخواست سن لی۔ اے اللہ کے رسول!''

اس موقعہ پر حضور نے دعا کی تلاوت نہیں کیا، اسی طرح قیامت کے ہولناک منظر کے بارے میں صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ سفارش کرنے کیلئے حضور ﷺ سجدہ میں گر جائیں، دیر تک سجدہ میں رہیں گے، اللہ تعالیٰ آپ کو وہ حمد وثنا الہام کرے گا، جن سے حضور اس وقت تک ناواقف تھے۔ اس موقعہ حضور ﷺ کو تلاوت کرنے کی ہدایت نہیں دی گئی،

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت کے الگ الگ مقامات، حالات اور آداب ہیں، اور علیحدہ تاثیر ہے۔ دعا کا مقام الگ، اس کے حالات تاثیرات الگ ہیں۔ بظاہر دونوں الگ الگ ہیں، لیکن ان دونوں کی حقیقت ایک ہے۔ اپنی جگہ پر تلاوت اور اپنی جگہ پر دعا دونوں ہی ٹھیک ہیں۔

پھر یہ کہ ملتزم کے متعلق حضور ﷺ نے حضرت عمر کو یہ تعلیم دی تھی۔ ''یہاں اے عمر! آنسو بہائے جاتے ہیں۔'' یہ جگہ دعا وخشوع کی ہے ذکر وتلاوت کی نہیں۔

عصر حاضر میں مسجد نبوی میں ختم قرآن کا معمول درحقیقت اس پر بحث بڑی دلچسپ ہے، اور کیوں نہ ہو کہ بذات خود ختم قرآن کی گفتگو خواہ جس جگہ ہو دل کے لئے فرحت بخش ہے، ضمیر میں بیداری پیدا کرنے والی ہے، کیوں کہ اس کا تعلق قرآن کریم سے ہے، جو پروردگار کے پاس نازل ہوا ہے۔

پھر جب یہ گفتگو مسجد نبوی اور مقدس جوار نبوی، رمضان مبارک اور عشرہ اخیر سے وابستہ ہو تو نا قابل بیان عظمت حاصل کر لیتی ہے، اس کی حقیقی تصویر تو پیش کرنا ممکن نہیں البتہ حتیٰ الامکان اپنے احساسات و شعور کو زیب قرطاس کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مسجد نبوی میں ماہ رمضان میں دو بار ختم قرآن ہوتا ہے: ایک نماز تراویح میں دوسرا اخیر شب کی تہجد میں، دونوں ۲۹ شب کو ہوتے ہیں، ایک اول شب میں دوسرا اخیر شب میں۔

شاید یہ (گوکہ غیر ارادی طور پر) اس امر سے مربوط ہو گیا کہ جبریل علیہ السلام ہر سال ایک بار رمضان میں حضور ﷺ کے ساتھ قرآن کا دور کرتے تھے، لیکن جس سال آپ کی رحلت ہوئی، اس سال دو بار دور کیے۔

اس رات مسجد نبوی میں چار بار دعا ہوتی تھی، دو بار ختم میں اور دو بار وتر کی نماز میں جس کی وجہ سے یہ رات بڑی نمایاں ہوتی تھی، پوری رات عبادت جاری رہتی ہے۔

اول شب میں ختم قرآن اس طرح ہوتا ہے کہ ۲۹ ویں رات کو قرآن کا صرف اخیر جز (عم) رہ جاتا ہے۔ امام صاحب شیخ عبدالعزیز بن صالح اس رات تنہا تراویح پڑھاتے ہیں۔ کوئی اور نہیں پڑھاتا آخری رکعات میں (قل اعوذ برب الناس) سے فراغت کے بعد رکوع سے قبل ختم قرآن کی دعا ان الفاظ میں شروع کرتے تھے، ''**صدق اللّٰہ العظیم لا الہ الااللہ المتوحد فی الجلال بکمال الجمال تعظیماً و تکبیرا المتفرد بتصریف الأحوال علی التفصیل والاجمال تقدیرا و تدبیراً**

ان شاءاللہ کتاب کے اخیر میں حتیٰ الامکان مکمل دعا ذکر کر دی جائے گی۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ موصوف بہت دیر تک کھڑے ہو کر دعا کرتے ہیں، اس قدر گریہ وزاری اور آہ و بکا ہوتا ہے کہ دل ہل جاتے ہیں، شعور بیدار ہو جائے، اور رحمت خداوندی کی امیدوں کے دروازے کے دروازے کھل جائے، کہ اس میں کثرت سے دعاء ماثورہ ہوتی ہے، جس میں دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی طلب ہوتی ہے، دعا کے بعد آخری بیسویں رکعت پوری کر کے سلام پھرتے ہیں، اور یہ دسواں سلام ہوتا ہے، جس کے

بعد تراویح ختم ہو جاتی ہے۔

نماز وتر شیخ علمی کے لیے چھوڑ کر ہٹ جاتے ہیں، شیخ علمی وتر پڑھاتے ہیں، دعا بھی کرتے ہیں، اور مشہور دعا قنوت پڑھتے ہیں، جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں، اللّٰھم اھدنا فیمن ھدیت ...الخ

اول شب کے اس ختم قرآن میں مرد وعورتیں، جوان بوڑھے سب آتے ہیں اور عید کی رونق ہوتی ہے، انواع واقسام کی دھونی دی جاتی ہے، نمازی ایک دوسرے کو دعا و مبارک باد دیتے ہیں نا قابل بیان منظر ہوتا ہے، اس کے بعد خدا کی رحمت کی امیدیں لئے ہوئے گھر لوٹتے ہیں۔

اخیر شب میں تہائی حصہ میں پھر ملکی غیر ملکی مرد وعورتیں، بوڑھے بچے اور جوان مسجد میں ختم قرآن میں شرکت کے لیے امڈ آتے ہیں۔ بہت سے لوگ خصوصاً جن کو روضہ میں جگہ مل چکی ہوتی ہے۔ اپنی جگہ سے ہلتے ہی نہیں ہیں، مسجد نبوی میں جاہ وجلال عظمت و ہیبت کا سماں ہوتا ہے، امام کا انتظار رہتا ہے، امام صاحب محراب نبوی میں کھڑے ہوتے ہیں، ابھی تین پارے (قد سمع ، تبارک ،عم) باقی ہوتے ہیں، اور معمول کے مطابق امام صاحب اور ان کے نائب باری باری پڑھاتے ہیں۔ شروع اور اخیر میں امام صاحب ہی پڑھاتے ہیں، سورہ (قل اعوذ برب الناس) پڑھ کر ختم قرآن کی دعا پڑھتے ہیں، پھر دونوں رکعات پوری کر کے سلام پھیر دیتے ہیں، پھر خود ہی امام صاحب وتر کی نماز پڑھاتے ہیں، وہ اول شب میں وتر نہیں پڑھے ہوتے۔ آخری رکعت میں دعا قنوت پڑھتے ہیں، وتر کا سلام پھیرنے کے بعد لوگ آگے بڑھ کر امام صاحب کو اور ایک دوسرے کو دعائیں، مبارکباد دیتے ہیں، اور ہر سال اس مقدس موقعہ کی آمد کی دعا اور قبولیت کی دعا کرتے ہیں۔

یہاں رک کر ہم کو مسجد نبوی میں تراویح کے تاریخی تسلسل پر ایک نظر ڈال لینی چاہئے، علماء مؤرخین اور سفر نامہ نویسوں مثلاً نابلسی، ابن جبیر، ابن بطوطہ اور عیاشی وغیرہ نے ہر چند کہ حرمین میں ختم قرآن کے عظیم جشن کا ذکر کیا ہے، جس میں شمعیں جلائی جاتی ہیں۔

انواع واقسام کے پھول لائے جاتے تھے، پٹاخے چھوڑے جاتے ہیں، قصائداور مناجات پڑھی جاتی تھیں وغیرہ وغیرہ۔

مسجد نبوی میں ختم قرآن اس وقت کے بہت لوگوں کا مقصود بن چکا ہے، کتنے ہی لوگ اس کے لیے سفر کر کے آتے ہیں، تا کہ اس مبارک مسجد اور جوار مقدس کی برکتوں اور خدائی عنایتوں سے بہرہ ور ہوں، زمان ومکان کے تقدس کے سبب اعمال کا ثواب بڑھ جاتا ہے، انہی اسباب کے پیش نظر مسجد نبوی، رمضان مبارک اور عشرہ اخیرہ میں ختم قرآن روحانیت کا مرقعہ بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نورانیت، جمال روحانیت، لذت اور معنویت تمام حاضرین کو اپنے دامن میں لے لیتی ہے۔

رحمتوں اور عنایتوں کے منظر کی عکاسی کرنا ممکن نہیں اور جس کو اس کی دولت ملی وہی اس کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے۔

اس بقعہ نور کی روحانیت کی تصویر کشی کیوں کر ہوسکتی ہے، خدائی عنایتوں کا اندازہ لگانا کیسے ممکن ہے؟ یہ اندازہ پیمانے کے حدود سے باہر ہے۔

رمضان میں روضہ شریف میں ختم قرآن کے موقع پر اس ذاتی احساسات اور اندرونی شعور کا تصور کوئی کیسے کرسکتا ہے۔ اس حالت میں تو احساس وشعور ہی مفقود ہو جاتا ہے۔ اس وقت تو صرف دلوں کی آہ، اور سینوں کی آواز ہی کانوں میں پڑتی ہے، اور ہاتھ پھیلائے گریہ وزاری کرنے والوں کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کے قطرے نظر آتے ہیں۔

یہ منظر بیان کرنے کے قابل نہیں، ہم اس کا احساس وتصور نہیں کر سکتے، بس حافظہ میں اس کا منظر باقی رہے گا، اور تاریخ کے صفحات پر روشن ومعطر پھول ہوں گے۔

امام اپنی دعا وگریہ وزاری ختم کرتا ہے، تو ہر شخص کو دلی سکون مل چکا ہوتا ہے، مناجات کی لذت سے بہرہ ور ہوتا ہے، اس کے گناہ اس کے آنسوؤں سے دھل چکے ہوتے ہیں، اور اس قدر فرحت وشادمانی اور سکون وراحت کا احساس ہوتا ہے، جو اس پر چھا جاتا ہے، یہ اس جگہ کے جلال، جوار مقدس کے شرف اور اس مکان کی فضیلت کا کرشمہ ہے،

انسان اپنے ذہن میں چودہ صدیوں کی تاریخ الٹتا ہے، شاندار روشن ماضی، قوت وطاقت کا سر بستہ راز اور اس روحانیت کا سرچشمہ دیکھتا ہے، جہاں حضرت جبریل کی آمد ہوتی تھی، یہ سب ایک سرسری طور پر ہو جاتا ہے، پھر امام وتر پڑھاتے ہیں، دعا قنوت پڑھتے ہیں، وتر مکمل کر کے سلام پھیرتے ہیں، پھر ایک دوسرے کو نیک تمنائیں، دعائیں اور مبارک باد دیتے ہیں، مقبولیت کی دعا کرتے ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے ساتھ جہنم سے رہا ہونے والوں میں شامل فرمالے۔ آمین

دعاء ختم قرآن:

اس دور میں مسجد نبوی میں ختم قرآن کے موقعہ پر کیا دعا پڑھی جاتی ہے؟

ظاہر ہے کہ اس باب میں کوئی مخصوص دعا حضور ﷺ سے منقول نہیں، کیوں کہ حضور ﷺ نے جن راتوں میں تراویح پڑھی، ان میں پورا قرآن نہیں پڑھا تھا۔ لہٰذا کوئی خاص دعا منقول نہیں۔

لیکن جیسا کہ ابن دقیق العید کہتے ہیں: جو چیز اپنی اصل کے لحاظ سے مشروع ہو وہ وصف کے ساتھ جائز ہے، یعنی اصلاً دعا مشروع ہے، کہ یہ عبادت کی بنیاد ہے۔ فرمان باری ہے: وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ

کہا تیرے رب نے پکارو مجھے میں قبول کروں گا تم کو۔

حضور ﷺ نے سجدہ میں خوب دعا کرنے کی ترغیب دی، آیت یا حدیث میں دعا کی کوئی تحدید وتعیین نہیں، اس لیے دعا میں اصل وضابطہ یہی ہے کہ عام ومطلق کوئی بھی دعا مانگی جائے، البتہ کچھ دعائیں صراحتاً منقول ہیں، مثلاً دعاء قنوت، دعاء تشہد اور نماز کے آغاز کی دعا نیز مسجد میں داخل ہونے اور نکلنے کی دعائیں وغیرہ۔ اس طرح کے موقع پر دعا ماثورہ ہی پڑھنی چاہیے۔

ان کے علاوہ دوسرے مواقع پر عام دعا ہوگی، آدمی حتی الامکان خوب جی لگا کر جو

آئے دعا کرے، جیسا کہ حضور ﷺ نے غزوۂ بدر کے موقع پر کیا تھا۔

ختم قرآن کا یہ عمل بھی خوب دعا کرنے کا موقع ہے، گزر چکا ہے کہ حضرت انسؓ اہل خانہ کو جمع کر کے دعا کرتے تھے، کوئی معین نص نہیں ملی، جیسا کہ آپ کا یہ عمومی لفظ گزر چکا ہے کہ ''اس کے لیے ایک مقبول دعا ہے''، یعنی ختم قرآن اور فرض نماز کے بعد، اس پر بحث چکی ہے ۔

اس وجہ سے کسی بھی معین ومخصوص دعا کی پابندی نہ کر کے اپنی ضرورت وحاجت کے اظہار کی دعائیں مانگیں، خواہ ماثور ہو یا غیر ماثور۔ بتایا جا چکا ہے کہ ختم قرآن میں دعا کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں امام احمدؒ نے فرمایا کہ جو چاہے دعا کرو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے ختم قرآن کی دعائیں منسوب ہیں، یہ نہ تو بہت طویل ہیں نہ بہت مختصر، حرمین شریفین میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

بسم الله الرحمٰن الرحيم وبه نستعين صدق الله العظيم الذى لا اله الا هو المتوحد فى الجلال بكما ل الجمال تعظيماً و تكبيراً المنفرد بتصريف الاحوا ل علىٰ التفصيل والاجمال تقديراً و تدبيرا المتعا ل بعظمته ومجده الذى نزل الفرقا ن على عبد ه ليكون للعا لمين نذيراً وصدق رسول الله ﷺ تسليماً كثيراالذى ارسله الىٰ جميع الثقلين : الجن الانس بشيراً و نذيراً و دا عيا الىٰ الله باذنه و سرا جاً منيرا اللّٰهم لک الحمد علىٰ ما انعمت به علينا من نعمک العظيمة و الآئک حيث أنزلت علينا خير كتا بک و أرسلت علينا أفضل رسلک و شرعت لنا أفضل شرائع دينک و جعلتنا من خير أمة اخرجت للنا س و هديتنا لمعا لم دينک الذى ارتضيته لنبيک و بنيته علىٰ خمس : شها دة أن لا اله الاالله و أن محمداً رسول الله و اقام الصلاة و ايتا ء الزكاه و صوم رمضا ن و حج بيت اللهالحرا م.

ولک الحمد علیٰ ما یسرته من صیا م شهر رمضا ن و قیا مه و تلاوة کتا بک العزیز الذی ﴿ لَا يَـأْتِيـهِ الْبَـاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَـنْزِيْلٌ مِنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴾ اللّٰهم صل علی محمد و علیٰ وآل محمد کما صلیت علی ابراهیم انک حمید مجید .اللّٰهم انا عبیدک، بنو عبیدک، بنو امائک نوا صینا بید ک ماض فینا حکمک عدل فینا قضا ؤک نسلک الله بکل اسم هو لک سمیت به نفسک أو انزلته فی کتا بک أو علمته أحدا من خلقک أو استا ثرت به علم الغیب عند ک أن تجعل القرآن العظیم ربیع قلو بنا و نور صدورنا وجلا ء احزا ننا وذها ب همومنا و غمومنا اللّهم ذکرنا منه ما نسینا و علمنا منه ما جهلنا وارزقنا تلا وته آنا ء اللیل و أطرا ف النها ر علی الوجه الذی یرضیک عنا اللّٰهم اجعلنا ممن یحل حلا له ویحرم حرا مه و یعمل بمحکمه و یو من بمتشا بهه و یتلو حق تلا وته اللّهم اجلعنا ممن یقیم حدود ه ولا تجعلنا ممن یقیم حروفه و یضیع حدود ه اللّٰهم اجعلنا ممن اتبع القرآن فقاده الیٰ رضوا نک و الجنة ولا تجعلنا ممن اتبعه القرآن فزج فی قفاه الیٰ النار و اجعلنا من أهل القرآن الذین هم أهلک وخا صتک یا أرحم الرا حمین !اللّهم ا غفر المؤمنین والمؤمنا ت والمسلمین و المسلما ت وألف بین قلوبهم وأصلح ذات بینهم ،انصر هم علیٰ عدوک و عدوهم واهدهم سبل السلام وأخرجهم الظلما ت الَی النور با رک لهم فی أسما عهم و أبصا رهم وذریا تهم و أزواجهم أبداً ما أبقیتهم واجعلهم شا کرین لنعمک مثنین بها علیک واتمها علیهم برحمتک یا أرحم الراحمین !اللّٰهم اغفر لی ولجمیع موتی المو منین الذین شهدوا لک با لوحدا نیة و لنبیک با لرسا لة وما تو ا علیٰ ذٰلک اللّهم اغفر لهم و ارحمهم و عا فهم واعف عنهم وأکرم نزلهم

ووسع مـد خـلهـم و اغسـلهـم بـا لـما ء والثلج والبرد و نقّهم من الذنوب والـخـطا يا كما ينقى الثو ب الا بيض من الدنس ﴿رَبَّـنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّـذِيْـنَ سَبَـقُـوْنَـا بـالْاِيْـمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَئُوْفٌ رَحِيْمٌ ﴾اللّٰهـم انا نسألك من الخير كلـه عا جله و آجلـه ما علمنا منه و ما لـم نعلم ،ونعـوذبك ونسألك من خير ما سألك منه عبد ك و رسـولك محمــد ﷺو عبا دك الصـــا لحون . و نعوذ بك من شـر ما استعا ذمنــه عبدك ورسولك محمد ﷺ وعبا دك الصالحون .

اللّٰهـم ان نسـألك الـجـنة ومـا قـرب اليهـا من قول أو عمل و نسـألك رضـاك و الجنة و نعوذبك من سخطك و النا ر اللّٰهم لا تدع لـنـا ذنبـا الا غـفرته ولا هماًالا فرجته ولا ديناًالاقضيته ولا مريضا الا شفيته ولا حـا جة هـى لك رضـا ولـنـا فيهاصلا ح الاقضيتها يا أرحم الرا حمين ﴿رَبَّـنَـا اغْـفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ ﴾﴿ رَبَّـنَـا لَا تُـزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْهَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَّابُ ﴾﴿رَبَّـنَـا لَا تُـؤَاخِـذْنَا اِنْ نَسِيْنَا اَوْ اَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَـلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّـا وَاغْـفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ ﴾ ﴿مَـنْ يَقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِيْ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِيْ الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّار ﴾ ﴿سُبْـحَـانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَـلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○اَلْحَمْدُ لِـلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ﴾و صـلـى الله عـلىٰ خير خلقه محمد و علىٰ آله و صحبه و سلم .

یہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے منسوب دعا ختم قرآن ہے، لیکن امام شیخ عبدالعزیز بن صالح حسب موقع اس میں کچھ جملوں کا اضافہ کرتے تھے، مثلاً:

اللّٰهم لا تجعل فينا ولا منا ولا معنا شقياً و لا محروماً
اللّٰهم انک أمرتنا بالدعا ووعدتنا با الا جا بة فلا ترد نا خائبين
اللّٰهم اجعلنا من عتقا ئک من النا ر و من المقبو لين
اللّٰهم ان رحمتک اوسع من ذنوبنا و عفو ک أوسع من خطايا نا
اللّٰهم هب المسيئين منا للمحسنين
اللّٰهم أنت الغنى عنا و نحن الفقرا ء اليک

اس کے علاوہ اور دوسرے الفاظ جن سے دل میں حرکت پیدا ہوتی ہے، اور روح میں جنبش پیدا ہوتی ہے، اور اخیر میں یہ پڑھتے تھے ﴿سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلٰى الْمُرْسَلِيْنَ ○الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ﴾ و صلى علىٰ نبينا محمد و علىٰ آله و صحبه و سلم .

پھر رکوع میں جاتے اور یہ دو رکعت پوری کرتے، پھر دو رکعت پڑھ کر ایک رکعات وتر ادا کرتے پھر الگ سے کوئی اور ختم قرآن نہیں ہوتا، کیوں کہ امام ایک ہیں الگ الگ جماعتیں نہیں ہوتیں۔ ایک ہی جماعت میں ایک امام سب کو پڑھاتا اور وہ شیخ عبدالعزیز بن صالح ہیں۔

مسئلہ امامت و وتر

یہ مسئلہ اصل موضوع سے خارج ہے لیکن چونکہ مسجد نبوی میں ایک امام کے پیچھے ختم قرآن کے باوجود وتر کی نماز الگ الگ ہوتی ہے یعنی سعودی دور آنے کے بعد تعدادائمہ کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے، لیکن احناف اب بھی وتر کی نماز، پیش امام سے الگ ہو کر ادا کرتے ہیں۔ اس کے پیش نظر ہمارے لیے دو سوال کھڑے ہوتے ہیں۔

دو سوال:

سوال اول: زمانہ قدیم میں ہر مذہب کا الگ الگ امام ہوا کرتا تھا، پھر سب کو ختم کر کے ایک امام مقرر کر دیا گیا، ایسا کیوں ہوا؟ پھر وہ امام کس مذہب کا مقرر ہوا؟ ہم

اشارتاً بتا چکے ہیں کہ سارے ائمہ کا ماخذ ایک ہے کتاب اللہ وسنت نبویہ۔

سوال دوم: کیا وجہ ہے کہ احناف حضرات فرض نماز تراویح، اور تہجد، یہ سب تو امام کے ساتھ پڑھتے ہیں لیکن وتر تنہا پڑھتے ہیں؟

یہی دونوں سوال ہمارے سامنے آتے ہیں ان کا جواب دیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ہمارا جواب کوئی حتمی فیصلہ کی شکل میں نہ ہوگا بلکہ ماضی کے تجزیہ وتحلیل اور حاضر سے استنباط کی شکل میں ہوگا، فیصلہ قارئین کے ہاتھ میں ہے۔ کیوں کہ یہ کتاب ہی تاریخی وفقہی تجزیہ کے انداز پر لکھی گئی ہے ان دونوں موضوعات کو مصنفین نے اپنی کتابوں میں ضمناً چھیڑا اور لکھا ہے، اور بعض حضرات نے اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، جیسا کہ ذکر آئے گا یہاں انہی دونوں سوالوں کا جواب دینے کی حد تک حتی الامکان سعی کریں گے۔

پہلا سوال یہ تھا کہ امام ایک ہی کیوں مقرر ہے؟ اس میں اختلاف نہیں کرنا چاہئے، اور نہ ہی اس کے اسباب پوچھنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ تمام نمازوں میں اصل یہی ہے، جو چیز اپنی اصل پر قائم ہوتی ہے، اس کی وجہ دریافت نہیں کی جاتی، ہاں خلاف اصل کی چیز کی وجہ معلوم کی جاتی ہے، سوال تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ مسجد نبوی میں الگ الگ ائمہ کے پیچھے الگ الگ جماعتیں کیوں ہوتی تھیں، کیوں کہ یہی خلاف اصل ہے، یعنی اس دور سے قبل ایسا کیوں ہوا؟ لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات گزر چکی اب اس میں قیل وقال کی ضرورت نہیں رہی۔

دین کا ایک بدیہی امر یہ ہے کہ اتحاد امت دین کا اہم مقصد ہے، پھر نماز جیسے کام میں اس اتحاد کا نظارہ اور زیادہ اہم ہے جس میں صفوں میں برابری ہوتی ہے، ایک طرف سے ادائیگی ہوتی ہے چھوٹا بڑا ذلیل، امیر فقیر مالدار سب پہلو بہ پہلو ایک ساتھ کھڑے ہوتے ہیں، اس کے خلاف ہر چیز کو صف اتحاد میں دراڑ پیدا کرنا شمار کیا جاتا ہے، خصوصاً مسجد نبوی میں جس اتحاد کا سرچشمہ، امت کا قلعہ اور مرکزی نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔

ساتویں صدی ہجری تک مسجد نبوی میں ایک ہی امام ہوا کرتے تھے، صرف تراویح کی نمازیں پہلی صدی ہی میں متعدد ائمہ کا ثبوت ملتا ہے لیکن اس کا سبب متعدد مذاہب کا وجود

نہیں؛ بلکہ نمازی اچھے قاری کے پیچھے پڑھنے کی خاطر ایسا کرتے تھے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ چیز نا گوار ہوئی، اور انہوں نے سب کو ایک امام حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پیچھے لگا دیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے اس کو ختم کر کے تمام قراء کو جمع کیا، ہر ایک کی قرأت سنی، سب سے تیز رفتاری سے پڑھنے والے کے لیے پچاس آیات، اور سب سے کم رفتار سے پڑھنے والے کے لیے تیس آیتیں مقرر کردیں.... الخ

اس طرح تراویح کے لئے چند ائمہ ہو گئے لیکن سب الگ الگ جماعت نہیں کرتے تھے، اور نہ وتر الگ الگ پڑھتے تھے، بلکہ ایک ہی جماعت کو باری باری سب پڑھاتے تھے، جیسا کہ حضرت عثمان وعلی رضی اللہ عنہما کے عہد میں ذکر آچکا ہے، ایک نماز الگ الگ جماعت کے ساتھ پڑھنے کا ثبوت ساتویں صدی ہجری ہی سے ہے جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ تعدد ائمہ کا یہ ایک تاریخی تجزیہ ہے، اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اسلاف میں سے کسی نے جماعت الگ الگ کی، جس کی اتباع ہو سکے، البتہ کچھ لوگ انفرادی طور پر تراویح یا وتر میں الگ الگ پڑھتے تھے، جو افضلیت وغیرہ میں اختلاف کا نتیجہ تھا۔

فقہی لحاظ سے:

تمام مذاہب میں تصریح ہے کہ قابل امامت کے پیچھے نماز درست ہے گو کہ وہ دوسرے مذہب کا ہو، یا مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب میں یہ شرط نہیں کہ نماز کے لئے امام کا مقتدی کے مذہب پر ہونا ضروری ہے، بلکہ ان کے دور میں ہر ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتا تھا۔

امام ابو یوسف تلمیذ امام ابوحنیفہ، امام مالک سے ملنے آئے تو ان کے پیچھے نماز پڑھی، اختلاف نہیں کیا، اسی طرح امام شافعی کی ملاقات امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام محمد سے ہوئی، اور ہر ایک نے دوسرے کے پیچھے نماز پڑھی، کوئی اختلاف نہیں ہوا، امام احمد نے امام شافعی کے پیچھے نماز پڑھی، کوئی اختلاف نہیں ہوا، اسی طرح سات صدیوں سے زیادہ عرصہ خود مدینہ میں گزرا، اختلاف مسلک کی بنیاد پر کسی امام کے پیچھے نماز پڑھنے سے

کسی نے گریز نہیں کیا، حالاں کہ بشمول مذاہب اربعہ دنیا کے اطراف واکناف کے حجاج کرام آتے رہتے تھے۔

لہٰذا ایک امام کا ہونا سلف کا عمل اور اصل کی پابندی ہے۔اس میں مسلمانوں کی صف بندی واتحاد کا اہم مقصد پورا ہوتا ہے،اور خود تمام مذاہب کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

یہ تو عام نمازوں یعنی پنجگانہ اور تراویح کی بات ہے۔رہا یہ سوال کہ کس مذہب کا امام مقرر ہو،تو ظاہر ہے کہ وہ امام احمد کے مسلک پر تھا۔

اس سلسلہ میں امام احمد کے مسلک کا انتخاب ایک فطری امر ہے،اس لیے کہ امام مقرر کرنے کا مقصد کسی اور مسلک کے انتخاب سے پورا نہیں ہوتا، کیوں کہ اس وقت پورے سعودیہ میں یہی مسلک رائج تھا، سارے سعودیہ میں تو حنبلی امام ہو،اور حجاز خصوصاً مسجد نبوی میں کسی دوسرے مسلک کا امام ہو، ایسا عملاً ممکن نہ تھا۔لہٰذا خاص حنبلی امام مقرر کرنا ایک فطری امر ہونے کے ساتھ ،مسلمانوں میں اتحاد اور حرم نبوی میں ایک امام کی تقرری کی مصلحت کی تکمیل کرنے والا ہے۔

اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ صرف حنبلی المسلک امام منتخب نہ ہوئے بلکہ دوسرے مسالک سے وابستہ حضرات کو بھی مسجد نبوی کی امامت کے لیے منتخب کیا گیا،ان کو پنجگانہ نمازوں میں کوئی نماز پڑھانے کا موقع دیا گیا۔جس کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے۔ مثلاً عہد سعودی سے قبل شیخ محمد خلیل ائمہ شافعیہ میں سے تھے،ان کو نماز ظہر پڑھانے کی ذمہ داری دی گئی۔

عہد سعودی سے قبل شیخ مولود ائمہ مالکیہ میں سے تھے،ان کو عصر پڑھانے کیلئے مقرر کیا گیا،عہد سعودی سے قبل شیخ اسعد ائمہ احناف میں سے تھے،ان کو نماز عشاء پڑھانے کی ذمہ داری دی گئی۔

فجر ومغرب کی نماز کی ذمہ داری شیخ عبد الرزاق حمزہ کو دی گئی ، جو علمائے اہل حدیث میں سے تھے،ان کے لیے شیخ تقی الدین ہلالی (جو خود علمائے اہل حدیث میں سے

تھے)اور شیخ محمد عبداللہ (جو مالکی تھے) کو معاون مقرر کیا گیا ،عہد سعودی میں مسجد نبوی کی امامت کے تاریخی حقائق واضح طور پر بتاتے ہیں کہ حنابلہ کے مسلک کا انتخاب دوسرے مذاہب والوں کی امامت سے مانع نہ تھا،اوراسی میں ملکی اتحادکو بروئے کارلانا تھا۔

ہم نے اس حقیقی واقعی حالت کا یہ تجزیہ،موضوع کے ایک جز کی طرف پیش کیا ہے، یعنی تراویح میں کیا تبدیلی ہوئی ، اوراس دور میں مسجد نبوی کی تراویح میں کیا انقلابات آئے بیان کر دیا گیا۔اگر سیاق کا تقاضا نہ ہوتا تو ہم اس سوال کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کرتے ،تاہم اس صورت وکیفیت کا بیان ہے،جیسا کہ تعداداور ہیئت کا بیان آ چکا ہے۔

دوسرے سوال کا جواب:

یعنی اس دور میں تعدد جماعت کا سلسلہ ختم ہونے کے باوجود احناف وتر علاحدہ کیوں ادا کرتے ہیں،ظاہر ہے کہ پہلے سے اس کا سلسلہ چلا آ رہا ہے، ہمارے علم کے مطابق بارہویں صدی ہجری سے ہوتا آ رہا ہے،جیسا کہ سمہودی نے ''وفاء الوفاء ''میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انھوں اس قت یہ دیکھا تھا۔

ان کی کتاب میں ہے کہ انہوں نے احناف کو اس اختلاف سے بچنے اور اتحاد کو قائم رکھنے کے لیے ایک مشورہ دیا تھا،انہوں نے کہا: چنانچہ انہوں نے ایک زمانہ تک میرے مشورہ پر عمل کیا پھر جذبات نفس پر مجبور ہو کر انہوں نے سابقہ معمول اختیار کر لیا۔

سمہودی نے ایک رسالہ ''مصابیح الظلام فی قیام شھر رمضان '' کے نام سے لکھا ہے،تلاش کے باوجود مجھے نہیں مل سکا،اس لیے یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کا مشورہ کیا تھا،اور کب تک اس پر عمل رہا۔

یہاں فقہی طور پر اس مسئلہ کا تجزیہ اور مذاہب اربعہ بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ حنفیہ اور مذاہب ثلاثہ کے مابین موازنہ وترجیح نہیں کر سکتے کہ یہ دیر طلب کام ہے جو ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

لیکن اس کو بالکلیہ نظر انداز کر دیا جائے ،ایسا بھی نہیں ہوسکتا ،لہٰذا اجمالی طور

پر قارئین کے لئے ضروری اسباب کی نشاندہی کر دینا چاہیے، تاکہ احناف کے الگ وتر پڑھنے کے اسباب کا علم ان کو بھی ہو جائے۔

اس کا سبب وتر کی احادیث کے بارے میں ان کے مفہوم، منطوق، ثبوت، درجۂ صحت اور ان میں ترجیح کے لحاظ سے اسی طرح وتر کی شکل، اس کی تعداد کیفیت اور صورت میں نقطۂ نظر کا اختلاف ہے، ان تمام اختلافات کا محور حسب ذیل نقاط ہیں:

اولاً ﴿**حکم وتر**﴾ احناف کے نزدیک وتر واجب ہے، جمہور کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔

لہٰذا احناف کے نزدیک اس میں احتیاط ہوگی، یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حنفیہ کے یہاں واجب جمہور کے نزدیک واجب سے الگ اصطلاح ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ واجب: فرض سے نیچے اور سنت سے اوپر کا درجہ ہے، لہٰذا وتر کے لیے اذان نہ ہوگی، اس کے منکر کو کافر نہ کہیں گے، اس لیے کہ اس کا ثبوت قطعی دلیل سے نہیں۔

دوم: ﴿**تعداد رکعات**﴾ احناف کے یہاں تین رکعت یا اس سے زیادہ ہے، کم نہیں، جمہور کے نزدیک ایک رکعت وتر صحیح ہے تاہم سب کا اتفاق ہے کہ وتر کی آخری حد تیرہ رکعات ہے جس کی چند صورتیں ہیں۔ اس پر احناف کے نزدیک وتر ایک ساتھ ایک سلام سے واجبی طور سے ادا کرنا مبنی ہے۔

سوم: ﴿**کیفیت نماز وتر**﴾ اگر تین رکعات پڑھنا ہے، تو احناف کہتے ہیں کہ تینوں رکعات کو ایک ساتھ، ایک تکبیر تحریمہ اور ایک سلام ہوگا۔ بیچ میں ایک تشہد ہوگا، ٹھیک مغرب کی طرح ادا ہوگی، جب کہ جمہور کہتے ہیں کہ الگ الگ ان کو ادا کرے۔ پہلے دو رکعات پر سلام پھیر دے، پھر ایک رکعات الگ سے پڑھ کر سلام پھیرے۔

چہارم ﴿**وتر میں قنوت**﴾ احناف کے یہاں رکوع سے قبل قنوت ہے، دعاء قنوت آہستہ آواز سے پڑھے، قرأت مکمل کر کے دعاء قنوت شروع کرنے کے لیے تکبیر کہے گا تاکہ لوگوں کو اس کا علم ہو جائے، جب کہ حنابلہ و شافعیہ رکوع کے بعد قنوت کے قائل ہیں، اور

یہ دعا قنوت جہراً پڑھتے ہیں۔ انہی اختلاف اور اعتبارات کے سبب مسجد نبوی میں نماز وتر کے مسئلہ میں احناف کا جمہور کے ساتھ ماضی اور حال میں اختلاف رہا ہے۔ لہٰذا احناف امام کے ساتھ فرض نماز اور تراویح پڑھتے ہیں کیوں کہ ان میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ وتر الگ پڑھتے ہیں، تاکہ ان کے مسلک کی رعایت ہو سکے یہ چیز فقہی لحاظ سے جائز ہو سکتی ہے، لیکن عملی طور پر اس انداز سے اس کی ادائیگی باعث سوال اور قابل توجہ ہے، یاد رہے کہ احناف کے یہاں ایسی نصوص موجود ہیں، جو ان کے دوسروں کے ساتھ اختلاف کو ختم کر سکتی ہیں، مسلک حنفی میں ابن وھبان کے قصیدہ میں یہ موجود ہے:

"لو حنفي قام خلف مسلم   لشفع ولم يتبع و تم فمو ثر"

یعنی حنفی کسی مسلمان کے پیچھے (خواہ کسی مسلک کا ہو) نماز وتر کے لیے کھڑا ہو کر تین رکعات وتر پوری کر لے، تو اس کی نماز ہو گئی۔

صاحب فتح القدیر علی شرح الھدایۃ نے ابو بکر راضی کے حوالہ سے اس کی تفصیل یوں لکھی ہے: اگر کوئی حنفی غیر حنفی کے پیچھے وتر پڑھے اور امام نے دوسری رکعات پر سلام پھیر دیا تو اس حنفی مقتدی کو دو امور کا اختیار ہے:

۱۔ وہ سلام نہ پھیرے اور امام کے ساتھ تیسری رکعات کے لئے کھڑا ہو جائے۔ کیوں کہ محل اجتہاد ہونے کے سبب امام کے سلام پھیرنے سے اس کی نماز ختم نہ ہو گی۔

۲۔ دو رکعات پر سلام پھیرنے کے بعد وہ اپنے امام سے الگ ہو کر اپنی نماز پوری کرے۔

بہر کیف اگر ان صورتوں پر عمل ہو تو اختلاف ختم ہو سکتا ہے، اور ہر ایک اپنے مسلک پر باقی رہے گا، دوبارہ یاد دلا دیں کہ یہاں مسلکی انداز پر اس مسئلہ کا تجزیہ نہیں کیا جا رہا ہے، کہ اس کی نصوص بکثرت ہیں، مسئلہ مشہور ہے، ہاں مسجد نبوی میں جو چیز قابل توجہ اور گراں معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مسجد نبوی میں ایک عبادت کی ادائیگی کے لیے مسلمانوں کے طریقہ ادا میں ظاہری اختلاف ہے، حالاں کہ اس اختلاف سے بچنے کی گنجائش ہے،

خصوصاً جب کہ ایسا کرنے میں عام آدمی کے لیے ممنوع میں پڑنے کا اندیشہ ہے، جو پیش امام کے ساتھ وتر پڑھنے کے بعد احناف کو جماعت کے ساتھ وتر پڑھتے ہوئے دیکھتا ہے، تو یہ سمجھ کر کہ نفل پڑھ رہے ہیں، شریک ہو جاتا ہے، اور ان کے ساتھ دوبارہ وتر پڑھ لیتا ہے، اور لاعلمی میں دوبارہ وتر ادا کر دیتا ہے، حالاں کہ حدیث ''ایک رات میں دو وتر نہیں'' میں صراحتاً اس سے ممانعت ہے۔

احناف کی کتابوں میں اس مسئلہ کو دوبارہ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ غیر رمضان میں وتر انفرادی طور پر ادا کرنا احناف کے نزدیک افضل ہے، اور رمضان میں مسجد میں باجماعت وتر کی ادائیگی کی افضلیت میں احناف کے یہاں اختلاف ہے۔

چنانچہ مراقی الفلاح میں: ''رمضان میں باجماعت وتر کی ادائیگی اخیر شب میں اکیلے پڑھنے سے افضل ہے، یہ قاضی خاں کا مختار قول ہے، دوسروں نے اس کے برخلاف کو راجح کہا ہے، اور شرح مراقی الفلاح میں ہے: ہمارے علماء کے یہاں مختار یہ ہے کہ گھر آ کر وتر پڑھے۔ جماعت سے نہ پڑھے'' اس کے بعد مصنف ابوبکر راضی کی سابقہ عبارت نقل کی ہے کہ کسی بھی مسلمان کے پیچھے وتر کی نماز درست ہے اور وہ اپنی نماز پوری کر لے، یا امام کے ساتھ ادا کرے اختیار ہے۔

اس عہد کے آغاز میں شیخ سلیمان عمری نے اس مسئلہ پر بحث کی تھی، موصوف اس وقت مدینہ کے قاضی مسجد نبوی کے دروس کے نگراں اور صدر المدرسین تھے، مسجد نبوی میں تمام مذاہب کے ماننے والے درس دیتے تھے، موصوف نے اس موضوع پر مستقل رسالہ لکھا، اور تمام مدرسین کو دعوت دی کہ وتر ایک جماعت میں ادا کی جائے، اور احناف کی مختلف کتابوں کے حوالے سے اقتباسات نقل کیے، اور تمام مدرسین سے کہا کہ اگر صحیح ہے تو اس کی توثیق کریں، اور غلط ہے تو تردید کریں۔

تمام مدرسین نے اس کی توثیق کی، اور اس پر عمل واجب قرار دیا، ان میں احناف بھی تھے، بلکہ اس رسالہ کی تالیف کے وقت ان میں سے بعض حضرات موجود ہیں۔

مرحوم کے رسالہ کے افتتاحی کلمات:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله الذی دل عبا ده علی طریق الهدیٰ و زجر هم عن أسباب التهلكة و الردی أوجب علیهم متا بعة النبی المصطفی و صلی الله علی من بعثه با لدین القویم،و الصراط المستقیم نبینا محمد و آله أصحا به أجمعین.

از سلیمان بن عبد الرحمٰن عمری بنام برادران مشائخ عظام متبعین ائمہ اعلام: احناف، مالکیہ، شافعیہ مدرسین حرم نبوی علیٰ **صا حبه افضل الصلاة و السلام.**

السلام علیکم و رحمة الله و بر کا ته! اللہ مجھے اور آپ کو اپنے علم پر عمل کی توفیق دے۔ آپ کو علماء کا یہ فرض معلوم ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی واقعہ پیش آئے، یا کسی چیز کا شرعی حکم دریافت کیا جائے، تو کتاب وسنت صحیحہ اور صحابۂ کرام اور ان کے بعد کے صدر اول کے عمل کو سامنے رکھیں۔ جو اس کے موافق ہو اس کا حکم اور اجازت دیں، اور اس کے خلاف سے روکیں، اور منع کریں۔

یہ طے ہے، لیکن میں مسجد نبوی میں ایسی چیز دیکھتا ہوں جو خاص طور سے مسجد رسول ﷺ میں نہیں ہونی چاہیے۔ وہ یہ کہ امام ابوحنیفہ کے بعض متبعین، امام صاحب سے الگ ہو کر تراویح کے بعد وتر ادا کرتے ہیں، جو غلط ہے، امام ابوحنیفہ سے اس کا قطعاً ثبوت نہیں، یہ اتحاد واتفاق قائم کرنے کے خدائی اختیار کے خلاف ہے، رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کے خلاف ہے، صحابہ، تابعین اور ان کے بعد صدر اول کے معمول کے خلاف ہے، آٹھ سال سے میں منتظر رہا تھا کہ شاید کوئی صاحب میرے بجائے یہ کام کر دیں، اور میں ان کے پیچھے رہوں، لیکن اس دور میں اس مسئلہ پر بحث کرنے کی توفیق نہیں ہوئی، اور نہ اس سے پہلے اور بعد میں علماء نے اس پر بحث کی، جیسا کہ انشاء اللہ آئے گا۔ لہٰذا میں اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی اور کم علمی کے باوجود کتاب وسنت میں اتباع کا حکم، اختلاف وتفریق سے اجتناب کے متعلق جو نصوص

ہیں ان کو ذکر کر دوں ، اسی طرح صحابہ کرام ، ان کے بعد حضرات ائمہ کرام اور ان کے بعد کے علماء کے اقوال پیش کروں ، اگر میری گزارشات درست ہیں تو الحمد للہ اور آپ اس کی تائید کریں ، ورنہ تنبیہ کر دیں ، اس لیے کہ حق ہی اتباع کے قابل ولازم ہے ، عام لوگ علماء کے اقوال اور فیصلوں کے تابع ہوتے ہیں ، اللہ ہمیں اور آپ کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق دے ، آمین ۔ اب ہم اللہ کی مدد کے ساتھ اصل مقصد کا آغاز کرتے ہیں ۔

اس کے بعد مرحوم نے وجوب اتباع واجتماع ، اور تفریق وابتداع کی ممانعت والی آیات واحادیث ذکر کیں ، پھر زیر بحث موضوع وتر میں اختلاف کے اسباب کی توجیہ کی ، اور حضرت عمرؓ نے جو تمام نمازیوں کو ایک امام کے پیچھے جمع کر دیا تھا ، اس کا ذکر کیا ۔

اس کے بعد خاص طور سے وتر میں سلف کی ایک دوسرے کی اقتداء کے بارے میں اقوال وافعال کا تذکرہ کیا ، مثلاً صاحب الہدایہ (جز اول) کی یہ عبارت نقل کی ہے : ’’اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شافعی کی اقتداء جائز ہے ، اور وتر میں دعا قنوت پڑھنے میں اس کی اتباع کرے گا .... الخ

اسی طرح شیخ محمد عبدالحی لکھنوی کا ان کے حاشیہ سے ایک طویل اقتباس نقل کیا ، نیز شیخ طیب بن ابوبکر عربی حضرمی شافعی ، شارح ہدایہ شیخ کمال الدین ہمام اور شیخ ملا علی قاری کا کلام نقل کیا ، اور مخالف مسلک کی اقتداء کے بارے میں شیخ علامہ محی الدین بن یوسف رومی حنفی کے رسالہ کا حوالہ دیا ہے ..... الخ ۔

حنفی کا شافعی کی اقتداء کے مسئلہ میں تاج الفضلاء معروف بہ امیر شاہ حنفی کے رسالہ کا اقتباس درج کیا ۔

مفتی حرم شریف شیخ محمد عبدالعظیم کے رسالہ ’’ **القول السدید فی الاجتهاد والتقلید** ‘‘ کا اقتباس نقل کیا ، اور اس موضوع پر شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے چیدہ چیدہ اقتباسات ہیں ۔

اخیر میں شیخ سلیمان نے اس موضوع پر شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا مکمل رسالہ نقل کیا

ہے کیوں کہ اس میں اس موضوع کے دلائل اور اس پر سیر حاصل بحث ہے، اور موصوف نے کہا: میں نے یہ رسالہ فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی دوسری جلد میں دیکھا ہے۔

ان سب کو ذکر کرنے کے بعد علماء کی تقریرات درج کی ہیں ہم ان میں سے سب سے مختصر تقریر جو شیخ طیب تنبکتی انصاری کی ہے۔حرف بحرف نقل کر رہے ہیں:

بسم الله الرحمٰن الرحيم و صلى الله على نبينا محمد و آله و صحبه ! میں نے اپنے دوست صدر المدرسین قاضی شیخ سلیمان عمری کا رسالہ دیکھا، تو یہ محسوس ہوا کہ یہی حق ہے اس سے عدول صرف وہی کرسکتا ہے جو اجماع کا مخالف ہو۔

اس کے بعد درجہ ذیل حضرات کی تقاریر درج ہیں:

شیخ صالح تونسی، عبدالرؤف عبدالباقی شافعی، شیخ احمد بساطی، شیخ محمد عبداللہ مدنی تنبکتی مالکی، شیخ محمد یوسف .....شیخ محمد مصطفیٰ بن امام علوی شنقیطی، شیخ سید قاسم اندیجانی حنفی شیخ احمد رشید احمد، شیخ محمد فوزی باطوی حنفی، شیخ عبدالجلیل عبداللہ حنفی۔

ان تمام حضرات نے شیخ سے اتفاق رائے رکھتے ہوئے وتر کی نماز کے لئے ایک جماعت ہونا واجب قرار دیا، کیوں مذہب احناف میں خصوصاً وتر میں غیر حنفی کی اقتداء جائز ہے، اور اس طرح سے امت میں اتحاد پیدا ہوگا، جیسا کہ یہی حکم الٰہی ہے۔

اس تاریخی تجزیہ کے خاتمہ پر ہم قارئین کو روک کر یہ سوال کرنا چاہتے ہیں، کیا اس ہزار سال سے زائد طویل تاریخ میں روز اول سے اب تک مسجد نبوی میں آٹھ رکعات پر اقتصار کیا گیا، یا بیس رکعات سے کم تراویح پڑھی گئی؟ یا یہ کہ ان چودہ صدیوں میں تراویح چالیس رکعات ہی رہی؟ کیا اہل مدینہ یا سابقین اولین میں سے کسی ایک فرد کو کہتے ہوئے سنا گیا کہ آٹھ رکعات سے زائد پڑھنا ناجائز ہے، کیوں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے آٹھ رکعات سے زائد نہیں پڑھا...الخ۔

یا ان حضرات نے قیام رمضان کی مطلق نصوص کے عموم سے جس میں تحدید نہیں، اور خاص طور پر رمضان اور بالاخص عشرہ اخیرہ عبادت میں جدوجہد کرنے کی نصوص سے سمجھا

ہے کہ رمضان کو دوسرے مہینوں پر اور عشرہ اخیرہ کو بقیہ ایام پر خصوصیت حاصل ہے؟ اور انہوں نے حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کے اس وقت کے عمل کو اختیار کیا، جب کہ صحابہ کی ایک جماعت موجود تھی، جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو دیکھا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہم عصر ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی نماز کے بارے میں ان کو علم تھا، انھیں یہ معلوم تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مکتب کے بچوں کو بلوا کر تراویح میں قرآن پڑھواتی تھیں تو کیا حضرت عائشہؓ نے آٹھ رکعات یا کسی اور کی تصریح کی ہے؟

جب چودہ صدی کے طویل عرصہ میں کوئی یہ کہنے والا نہیں ملتا کہ آٹھ رکعات سے زیادہ پڑھنا ناجائز ہے، اور اس طویل عرصہ میں مسجد نبوی میں باجماعت صرف آٹھ رکعات تراویح پڑھنے والا بھی کوئی نہیں ملتا تو ان حضرات سے جو آٹھ رکعات پر اضافہ ناجائز کہتے ہیں، یہی نہیں بلکہ اس کی تبلیغ کرتے ہیں، کم از کم یہ کہا جائے گا کہ خلفائے راشدین کے عہد سے آج تک امت کی اتباع اور صدر اول سے اب تک جماعت مسلمین کی موافقت کرنا ان کی مخالفت کرنے سے بہتر ہے، خصوصاً اس شخص کے لیے جو مسجد نبوی میں امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہے کیونکہ حضرت ابوذر کی سنن نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی (امام ترمذی نے اس کی تصحیح کی ہے) اور بیہقی میں یہ روایت ہے ''ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رمضان کا روزہ رکھا، حضور ﷺ نے ہمیں کسی دن تراویح نہیں پڑھائی جب ۲۳ ویں رات آئی، تو ہمارے ساتھ قیام لیل کیا جو تقریباً تہائی رات تک جاری رہا، ۲۴ ویں رات کو قیام نہیں فرمایا اور ۲۵ ویں رات کو قیام فرمایا، جو نصف شب تک جاری رہا، ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول بقیہ رات کے حصہ میں نفل پڑھا دیجئے؟ آپ نے فرمایا: اگر انسان امام کے ساتھ نماز پڑھے اور امام کے لوٹنے تک ساتھ رہے، تو اس کیلئے بقیہ رات کا ثواب لکھ دیا جاتا ہے۔'' حضور ﷺ نے امام کے ساتھ قیام لیل اور اس کے ساتھ لوٹنے کو بقیہ رات کے قیام کے درجہ میں قرار دیا، لیکن امام کے لئے اس کی تحدید نہیں فرمائی، کوئی معین تعداد مقرر نہیں فرمائی۔ ہاں جو گھر میں پڑھ رہا ہے، اس کو اختیار ہے زیادہ پڑھے یا کم، جب دوسرے سے

وابستہ نہیں تو خود کا مالک ہے، اگر چاہے تو تعداد کم کر کے، تلاوت زیادہ کر لے اور اگر چاہے تو تعداد بڑھا کر دیر تک قیام میں اپنے لئے تخفیف کر لے، جس کی دلی رغبت ہو کرے۔ مسجد نبوی میں چودہ صدیوں تک تراویح کے تاریخی تجزیہ کا یہ نتیجہ سامنے آیا۔ اس موقع پر ہم چاہتے ہیں، اس کا فقہی تجزیہ بھی پیش کر دیا جائے۔

سب سے بہتر یہ ہے کہ ہم ائمہ اربعہ کے اقوال اور مذاہب اربعہ کے ماننے والوں کے عمل کو پیش کر دیں تا کہ قارئین کو ان کی آراء اور سند کا علم ہو جائے، ہم ان مذاہب کے اقتباسات انہی کی کتابوں سے درج کریں گے تا کہ مراجعہ میں سہولت رہے۔

تراویح اور مذاہب اربعہ:

اب تک عہد نبوت سے چودہویں صدی تک کی اسلامی تاریخ میں تراویح کے تسلسل سے بحث تھی، اور خاص طور پر مسجد نبوی میں تراویح پر مرکوز تھی، اس موضوع کی تکمیل کے لئے اس پر فقہی لحاظ سے بحث کی جارہی ہے تا کہ تراویح کے مسئلہ میں مذاہب اربعہ کا نقطۂ نظر واضح ہو جائے اور قارئین کی نظر میں فقہی پہلو بھی آجائے۔ ہماری خواہش ہے کہ تعصب کی تہمت سے بچنے، اور ہر مذہب کی خدمت کے جذبہ سے کسی ایک مذہب کے اقوال کو ذکر کرنے کے بجائے تمام مذاہب کی آراء ذکر کر دی جائیں، خصوصاً اس لئے کہ زیر بحث مسئلہ میں تمام مذاہب کے مابین حد درجہ اتفاق اور قرب پایا جاتا ہے۔

تا کہ قراء کرام کو اندازہ ہو جائے کہ اس تعداد پر کس قدر اتفاق ہے، اور یہ کہ ہر ایک کے یہاں بیس رکعات ہی ہے، اسی طرح اہل مدینہ کے عمل کے بارے میں سب کا اتفاق ہے۔

ماسبق میں جو نصوص ذکر کی جا چکی ہیں وہ مع اسلاف کے عمل کے تمام ہی حضرات کے دلائل ہیں، چوں کہ امام مالک، امام دار الہجرت کہلاتے ہیں۔ اس لیے آغاز انھیں کے مذہب سے کر رہے ہیں۔

مذہب امام مالک:

مدینہ میں امام مالک کے عہد میں تراویح کا ذکر آچکا ہے، اب خود ان کے مذہب میں عمومی طور پر، اور تمام شہروں کے معمول کا ذکر کیا جارہا ہے، مذہب امام مالک کا سب سے بہتر ماخذ مؤطا ہے گو کہ مذہب میں اسکے علاوہ بھی کئی کتابیں ہیں، لہٰذا ہم مؤطا ہی کو پیش نظر رکھ کر، ان کے اقوال کو پہلے ذکر کر رہے ہیں۔

امام مالک نے مؤطا میں قیام رمضان کے متعلق لگا تار دو باب قائم کئے ہیں:

پہلا باب: رمضان میں عمومی ترغیب نماز کے لئے ہے اس میں امام صاحب نے دو حدیث ذکر کی ہیں۔

دوسرا باب: خاص طور پر قیام رمضان یعنی تراویح سے متعلق ہے۔

دوسرے باب میں غالباً امام مالک یہ بتانا چاہتے ہیں کہ لفظ تراویح ان کے زمانے میں مشہور نہ تھا، مشہور لفظ ''قیام'' ہی تھا۔ مؤطا میں ہے ''رمضان میں نماز کی ترغیب''

ا۔ ہم سے یحییٰ نے، ان سے مالک نے، ان سے ابن شہاب نے، ان سے عروہ بن زبیر نے، ان سے حضرت عائشہؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک رات مسجد میں نماز پڑھی، آپ کے پیچھے کچھ لوگوں نے بھی نماز پڑھی، پھر آپ نے اگلی رات نماز پڑھی، لوگوں کی تعداد بڑھ گئی، پھر تیسری یا چوتھی رات کو لوگ جمع ہوئے، لیکن آپ ان کے پاس نکل کر نہیں گئے، صبح کو آپ نے فرمایا: رات کا تمہارا اجتماع میں نے دیکھا تھا میرے نکلنے سے صرف یہ مانع ہوا کہ تم پر یہ فرض نہ ہو جائے۔ یہ رمضان کا واقعہ ہے۔

ب۔ مجھ سے امام مالک کے واسطے سے بیان کیا، انہوں سے ابن شہاب سے انہوں ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن بن عوف سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ قیام رمضان کی ترغیب دیتے تھے، عزیمت کے ساتھ حکم نہیں فرماتے تھے، آپ فرماتے تھے ''جس نے ایمان کے ساتھ ثواب کی نیت سے قیام رمضان کیا اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے۔'' ابن شہاب نے کہا: حضور ﷺ کی وفات ہوگئی، اس

وقت یہی معمول جاری تھا، پھر حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے شروع میں یہی معمول جاری رہا۔اس باب میں دو احادیث نقل کی ہیں:

پہلی حدیث آپ کا تقریر و فعل ہے جب کہ دوسری حدیث قولی ہے، پھر یہ بتانے کیلئے حضرت ابن شہاب کا اثر نقل کیا کہ اس میں نسخ یا اضافہ نہیں ہوا۔ نیز یہ کہ شیخین نے اسی پر عمل کیا۔

پھر کہا: قیام رمضان کا بیان:

مجھ سے مالک نے، ان سے ابن شہاب نے، ان سے عروہ بن زبیر نے، ان سے عبدالرحمٰن بن عبد قاری نے بیان کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رمضان میں مسجد میں آئے، تو لوگوں کو الگ الگ نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، کوئی تنہا پڑھ رہا تھا، کوئی چند آدمیوں کو لے کر پڑھ رہا تھا۔ حضرت عمر نے فرمایا: بخدا! مجھے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اگر ان سب کو ایک قاری کے پیچھے لگا دوں تو بہت اچھا ہوگا، چنانچہ سب کو ابی بن کعب کے پیچھے جمع کر دیا، پھر راوی نے کہا ایک اور رات میں ان کے ساتھ نکلا، لوگ اپنے قاری کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے، حضرت عمر نے فرمایا:

کیا خوب بدعت (نئی چیز) ہے یہ! رات کے جس حصے میں تم سوتے تھے، وہ اس حصہ سے بہتر ہے، جس میں قیام کرتے ہو۔یعنی اخیر شب، لوگ شروع شب میں ''قیام'' کر لیتے تھے۔

مجھ سے امام مالک کے واسطے سے، انہوں نے محمد بن یوسف سے، انہوں نے سائب بن یزید سے بیان کیا کہ حضرت عمر بن خطاب نے ابی بن کعب اور تمیم داری کو حکم دیا کہ لوگوں کو گیارہ رکعات ''قیام لیل'' کرائیں قاری صاحب مئین پڑھتے تھے، حتیٰ کہ قیام لمبا ہونے کے سبب ہم لوگ لاٹھیوں کے سہارے کھڑے ہوتے تھے، اور ہم لوگ فجر طلوع ہوتے وقت لوٹتے تھے۔

مجھ سے مالک کے واسطے سے بیان کیا، انہوں نے یزید بن رومان سے بیان کیا

لوگ حضرت عمر کے زمانہ میں ۲۳ رکعات تراویح پڑھتے تھے،

مجھ سے مالک کے واسطے سے، انہوں نے داؤد بن حصین سے بیان کیا کہ انہوں نے اعرج کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے لوگوں کو اس وقت پایا، جب کہ وہ رمضان میں کفار پر لعنت بھیج رہے تھے، راوی نے کہا قاری صاحب سورہ بقرہ آٹھ رکعات میں پڑھتے تھے، اگر بارہ رکعت میں پڑھ لیتے تو لوگ یہ خیال کرتے کہ انھوں نے تخفیف کر دی ہے۔

مجھ سے مالک کے واسطے سے انھوں نے عبداللہ بن بکر کے واسطے سے بیان کیا کہ میں نے اپنے والد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہم رمضان میں لوٹتے تو خدام سے جلدی جلدی کھانا مانگتے کہ کہیں فجر طلوع نہ ہو جائے۔

مجھ سے مالک کے واسطے سے بیان کیا ان سے ہشام بن عروہ نے، ان سے ان کے والد نے بیان کیا کہ ذکوان ابوعمرو (جو ام المؤمنین حضرت عائشہ کے غلام تھے، حضرت عائشہ نے ان کو اپنی موت کے بعد آزاد ہونے کا عہد دیا تھا) رمضان میں حضرت عائشہ کو قرآن سناتے تھے۔

حاصل نصوص، چونکہ پہلے باب کی نصوص عام ہیں، اس لئے اس کے بعد تفصیلی نصوص کا ذکر کیا، گویا یہ اجمال کے بعد تفصیل ہے، اور حد درجہ تصنیفی مہارت کی غماز ہے۔

انھوں نے واضح کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام نمازیوں کو ایک امام کے پیچھے اکٹھا کر دیا، یعنی ایک جماعت قائم کر دی اور اسی کو" کیا خوب بدعت ہے" کہا ہے، یعنی سب کو ایک قاری پر جمع کرنے کی بات کو، اور اس امر کو کہ رات کے جس حصہ میں وہ سو جاتے تھے وہ اس سے افضل ہے۔ اس کے بعد دوسری حدیث میں تعدا د رکعات کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے گیارہ رکعات لمبی قرأت کے ساتھ (حتیٰ کہ ایک رکعت میں مئین بھی پڑھ لیتے تھے) پڑھنے کا حکم دیا۔

چنانچہ قاری صاحب اس قدر لمبی قرأت کرتے تھے کہ لوگ لاٹھیوں کا سہارا لیتے تھے، اور ساری رات ختم ہو جاتی تھی،

اس کے بعد گیارہ رکعات کے بجائے ۲۳ رکعات کا بیان ہے۔

چوتھی حدیث میں ہے کہ عادتاً سورہ بقرہ آٹھ رکعات میں پڑھتے تھے، اور بارہ رکعات میں پڑھ لینا تو خلاف عادت تخفیف تصور کی جاتی تھی۔ نیز رمضان کے قیام میں قنوت ہوتا تھا، اور اسی طرح اس میں آٹھ رکعات سے اضافہ کی طرف بھی اشارہ ہے، یعنی سورہ بقرہ آٹھ رکعات میں پڑھنے کی حالت میں۔

پانچویں حدیث میں ہے کہ تاخیر سے سحری کھاتے تھے، اور طلوع فجر کے خوف خدام سے جلدی جلدی کھانا مانگتے تھے۔

چھٹی روایت میں ہے کہ کچھ لوگ عام جماعت سے الگ ہوکر اپنا امام مقرر کر لیتے تھے، خصوصاً عورتیں ایسا کرتی تھیں، اور گھروں کے اندر ہوتا تھا۔ موطأ میں امام مالک کے قول کا خلاصہ یہی ہے۔ اور یہ سند واستدلال کے لحاظ سے اصل ہیں:

مالکی مذہب کی نصوص: متاخرین مالکیہ کے نزدیک معتمد جیسا کہ مختصر خلیل کی عبارت ہے:

اور تراویح، اور اس کو انفرادی طور پر پڑھنا اگر اس کی وجہ سے مساجد معطل نہ ہو جائیں، تراویح میں ختم قرآن کرنا، ایک سورہ کافی ہے، ۲۳ رکعات ہوگی، پھر ۳۶ رکعات مقرر کردی گئی... الخ

اس سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے اصل تراویح ۲۳ رکعات ہے، پھر بڑھا کر ۳۶ رکعات کردی گئی، خود امام مالک کی نصوص کیا ہیں؟ ان کا ذکر مؤطا مالک کے حوالہ سے آچکا ہے۔

باجی جو متقدمین مالکیہ میں سے ہیں انھوں نے مؤطا کی شرح (۲۰۸/۱) میں تراویح کے موضوع کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے لکھا کہ "فصل ان کا قول: گیارہ رکعات یعنی سائب بن یزید کی حدیث میں امام مالک کا قول، انھوں نے کہا شاید حضرت عمر نے اس سلسلہ میں حضور ﷺ کی نماز پابندی کی ہے۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت

میں ہے کہ حضور ﷺ رات کو گیارہ رکعات پڑھتے تھے پھر انھوں نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں رمضان میں کتنی رکعات ہوتی تھیں، اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں:

سائب کی روایت میں گیارہ رکعت۔

یزید بن رومان کی روایت میں: ۲۳ رکعات۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام نافع کی روایت ہے کہ انھوں نے لوگوں کو ۳۹ رکعات پڑھتے ہوئے پایا، جن میں ۳ وتر تھی، یہی امام مالک کے یہاں مختار ہے۔ امام شافعی کے یہاں مختار ۲۳ رکعات ہے، وتر کے علاوہ جیسا کہ یزید بن رومان کی روایت ہے، ممکن ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گیارہ رکعات کا حکم قرأت لمبی کرنے کے لئے دیا ہو کہ قاری ہر رکعت میں مئین پڑھتا تھا، اسلئے کہ لمبی قرأت کرنا، نماز میں افضل ہے۔

جب لوگوں کو گرانی محسوس ہوئی تو طول قرأت میں تخفیف کرتے ہوئے ۲۳ رکعات کا حکم دیا، تعداد رکعات کے اضافہ سے فضیلت کی کچھ تلافی کردی، قاری صاحب سورہ بقرہ آٹھ رکعات یا بارہ رکعات میں پڑھتے تھے، جیسا کہ اعرج کی روایت میں ہے۔

کہا گیا کہ تیس سے بیس آیات پڑھتا تھا۔ واقعہ حرہ تک یہی سلسلہ جاری تھا، لوگوں کو قیام بھاری محسوس ہوا تو قرأت مختصر کر کے تعداد رکعات میں اضافہ کردیا۔ ۳۶ رکعات ہو گئیں، اور تین رکعات وتر تھی، پھر یہی سلسلہ جاری رہا۔

حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنے دور میں حکم دیا کہ ہر رکعات میں دس آیات پڑھے، امام مالک نے ناپسند کیا ہے کہ قرأت وتر کو کم کریں۔

اسی پر ائمہ کا عمل اور جماعت کا اتفاق رہا اور یہی افضل بمعنی تخفیف ہے۔ شیخ ابو القاسم نے کہا یہ طویل آیت کا حکم ہے، امام ابوالولید نے کہا: یہ میرے نزدیک جماعتوں اور مساجد کے بارے میں ہے، لیکن اگر کوئی انفرادی طور پر گیارہ رکعت پڑھے، اور ہر رکعت میں مئین پڑھ لے تو افضل ہے، حضور ﷺ سے مروی ہے کہ افضل نماز وہ ہے جس میں قیام لمبا ہو"۔

اس کے بعد انھوں یزید بن رومان کی روایت کے ۲۳ رکعات نماز کی کیفیت کا ذکر

کرتے ہوئے کہا: مراد بیس رکعات، وتر اور ان دو رکعتوں کے علاوہ جو پورے سال وتر کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں، بیس رکعات میں پانچ ترویحہ ہوں گے، ہر چار رکعات پر ایک ترویحہ ہے، ہر دو رکعات پر سلام پھیرے گا۔ ائمہ کا معمول رہا ہے کہ تراویح کے ہر دو ترویحہ کے درمیان دو ہلکی رکعتوں کے ذریعہ فصل کرتے ہیں اور یہ دو رکعات تنہا تنہا پڑھتے ہیں، اس کی دو وجوہات ہیں:

اول: تعداد رکعات صحیح طور پر یاد کرنا آسان ہو، اور غلطی کا کم از کم شائبہ رہے۔

دوم: اس دوران جس کی کوئی ایک رکعت چھوٹ گئی ہے، اس کو پورا کر لے۔

چھوٹی ہوئی تراویح کی قضاء کا طریقہ:

ظاہر ہے کہ طریقۂ قضاء کا، ایک گونہ ربط طریقہ ادا سے ہوتا تھا۔ تراویح کی ادائیگی کا طریقہ گزر چکا ہے کہ پانچ ترویحہ ہوتے ہیں، ہر چار رکعات کا ایک ترویحہ، اور ہر دو رکعات پر سلام ہوتا ہے اور ہر دو ترویحہ کے بعد دیر تک کھڑے رہنے کے بعد کچھ دیر آرام کرتے ہیں۔ مجموعی رکعات بیس ہیں۔

البتہ بسا اوقات تنہا تنہا دو ہلکی رکعات پڑھتے ہیں یعنی ہر ترویحہ کے درمیان دو رکعات اور یہ مدینہ منورہ میں ہوتا ہے۔ امام احمد اس کو مکروہ کہتے ہیں، جیسا کہ ان کے مذہب کے بیان کے ضمن میں آئے گا۔ ان شاء اللہ

لہٰذا اگر مسبوق کو امام کے ساتھ ایک رکعات ملی، ہو تو دو حال سے خالی نہیں: ترویحہ کی ابتدائی دو رکعتوں میں سے ہوگی یا اخیر کی دو رکعتوں میں سے:

(الف) اگر اخیر کی دو رکعتوں میں سے ہو تو وہ اس چھوٹی ہوئی رکعات کی قضا اس وقت کرے، جب کہ نمازی آرام کر رہے ہوں، یا امام صاحب ہلکی دو رکعتیں پڑھ رہے ہوں۔

(ب) اگر ابتدائی دو رکعتوں میں سے کسی کو ایک رکعت ملی تھی، تو ''المنتقی'' میں ہے ابن قاسم نے امام مالک سے روایت کیا: وہ امام کے سلام کے ساتھ سلام نہ پھیرے بلکہ وہ امام کے ساتھ اس کی اقتداء کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہو۔ پھر جب امام اخیر کی دو رکعتوں میں

سے پہلی رکعت پڑھ کر دوسری رکعت کیلئے اٹھنا چاہے تو یہ کھڑا نہ ہو بلکہ اپنی جگہ پر بیٹھ کر اپنے طور پر تشہد پڑھے سلام پھیرے اس طرح وہ اپنے حق میں ابتدائی دو رکعتیں پوری کرنے والا ہو گیا۔ اس کے بعد اٹھ کر امام کے ساتھ اخیر کی دو رکعتوں میں سے آخری رکعت میں شریک ہو جائے، جب امام بیٹھ کر تشہد پڑھے، تو یہ بھی بیٹھ جائے، لیکن امام سلام پھیرے تو سلام نہ پھیرے، بلکہ اٹھ کر باقی رکعت پوری کرے۔

مذہب امام مالک میں قرأت کے آغاز میں بلند آواز سے اعوذ باللہ، بسم اللہ پڑھنا۔

عبدالرحمن بن قاسم سے روایت ہے کہ امام مالک سے قیام رمضان کے متعلق دریافت کیا گیا کہ قاری کتنی آیات پڑھے؟ فرمایا: دس دس آیات اور جب مختصر سورتیں آجائیں تو بڑھادے مثلاً ''صافات'' ''طسم'' ان سے دریافت کیا گیا کہ پانچ آیات؟ فرمایا نہیں، دس آیات پڑھے۔

خاص طور پر قیام رمضان میں جہراً اعوذ باللہ بسم اللہ پڑھنے کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے، باجی نے شرح مؤطا (۲۰۸/۱) میں کہا: مسئلہ: استعاذہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، یعنی رمضان میں۔ المدونہ میں امام مالک سے ابن قاسم کی روایت یہی ہے اور ''عتبیہ'' میں اشہب سے مروی ہے: اس کا ترک کرنا میرے نزدیک زیادہ پسند ہے۔

ابن قاسم کی روایت کی وجہ فرمان باری ہے: ''فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ'' کہ یہ آیت ان کے نزدیک خارج نماز قرأت پر محمول ہے کیوں کہ یہ ایسا لفظ ہے جو مانوس نہیں، لہٰذا عام کلام کی طرح اس کو بھی قرأت میں لانا مسنون نہ ہوگا۔

(تفریع): اگر ہم جائز کہیں تو ابن حبیب نے امام مالک سے روایت کیا ہے: اس کو جہراً پڑھے اور اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے: اس کو جہراً پڑھنا مکروہ ہے۔

ابن حبیب کی روایت کی وجہ یہ ہے کہ یہ قیام کی حالت میں مشہور ذکر ہے، تو گویا سراً و جہراً ہونے میں اس کا حکم قرأت کے حکم کی طرح ہے۔ اور اشہب کی روایت کی وجہ یہ ہے کہ یہ "معجز" نہیں، لہذا اس کا مقام سراً پڑھنا ہے، تا کہ معجز و غیر معجز میں تفریق ہو سکے۔

ابن حبیب نے اس کو امام مالک سے قاری کے آغاز کرنے کے بارے میں روایت کیا، ابن حبیب نے کہا یہ اس کے ذریعہ سے ہر رکعت کا آغاز کرے۔

تراویح کے بارے مذہب مالکیہ کا خلاصہ:

اول: ﴿تعداد رکعات﴾ مصرح و معمول بہ ۲۳ر رکعات ہے، پھر اس میں اضافہ کر کے ۳۶ رکعات کر دیا گیا، تین رکعات وتر پڑھتے ہیں۔ مجموعی رکعات ۳۹ ر رکعات ہو جاتی ہے۔

دوم: باجی نے وضاحت کی ہے کہ اضافہ کرنے کا سبب حضرت ابن عمر کے آزاد کردہ غلام نافع کی اس روایت کو ترجیح دینا ہے کہ میں نے لوگوں کو مدینہ میں ۳۹ ر رکعات پڑھتے ہوئے پایا۔

سوم: باجی ہی نے بیان کیا ہے کہ اصل ۲۳ ر رکعات ہے، البتہ ائمہ کا معمول رہا ہے کہ ہر دو ترویحہ کے درمیان تنہا تنہا دو رکعت پڑھتے ہیں، اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ تا کہ تعداد کو اچھی طرح یاد رکھا جا سکے، اور تا کہ مسبوق امام کے ساتھ فوت شدہ رکعات کی تکمیل کر سکے۔

چہارم: اعوذ باللہ و بسم اللہ جہراً جائز ہے، اسی طرح قنوت کا آغاز (**اِنَّـا فَتَـحْـنَـا لَکَ فَتْحًا مُبِيْنًا**) سے ہوگا۔

پنجم: حافظ قرآن کو اگر سستی پیدا ہونے اور مساجد کے معطل ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو اس لیے تنہا تراویح پڑھنا افضل ہے، اس کے علاوہ دوسروں کے لیے جماعت سے پڑھنا افضل ہے۔

مذہب احناف:

فتح القدیر علیٰ الهدا یه (۱/۳۳۳) میں ہے: ''فصل: قیام رمضان کے بیان میں۔ مستحب ہے کہ لوگ ماہ رمضان میں عشاء کے بعد جمع ہوں، امام ان کو پانچ ترویحہ پڑھائے، ہر ترویحہ میں دو سلام ہوگا، اور ہر دو ترویحہ پر ایک ترویحہ کی مقدار بیٹھے گا، پھر ان کو وتر پڑھائے۔

مصنف نے لفظ استحباب ذکر کیا ہے، حالانکہ اصح یہ ہے کہ تراویح سنت ہے، حسن نے امام ابوحنیفہؒ سے یہی روایت کیا ہے، کیوں کہ خلفائے راشدین نے اس پر مواظبت کی ہے، اور حضور ﷺ نے اس کی مواظبت خود نہ کرنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ''اندیشہ ہے کہ تم پر فرض ہو جائے''۔ ''اور اس میں سنت باجماعت ہے'' لیکن یہ کفایہ کے طور پر ہے حتیٰ کہ اگر تمام مسجد والے تراویح نہ پڑھیں، تو بہت برا کرنے والے ہوں۔۔۔ لیکن اگر کچھ لوگ باجماعت ادا کر لیتے ہیں، تو جماعت میں شرکت نہ کرنے والا افضیلت کو ترک کرنے والا ہے، اس لیے کہ اکا دکا صحابہ رضی اللہ عنہم سے جماعت میں شرکت نہ کرنا مروی ہے۔ دو ترویحہ کے درمیان بیٹھنے میں مستحب یہ ہے کہ ایک ترویحہ کے بقدر ہو، اسی طرح پانچویں ترویحہ اور وتر کے درمیان، کیوں کہ یہی اہل حرمین کی عادت ہے۔ بعض حضرات نے پانچ سلاموں کے بعد استراحت کرنے کو مستحسن قرار دیا ہے، جو صحیح نہیں۔ ان کا قول ''پھر ان کو وتر پڑھائے'' اس میں اشارہ ہے کہ تراویح کا وقت عشاء کے بعد وتر سے قبل ہے، یہی عام مشائخ کا قول ہے، لیکن اصح یہ ہے کہ اس کا وقت عشاء کے بعد اخیر رات تک وتر سے قبل و بعد ہے، کیوں کہ یہ نفل ہے، جو عشاء کے بعد مسنون ہے۔

مصنف نے اس میں قرأت کی مقدار ذکر نہیں کی۔ اکثر مشائخ **رحمهم الله** کے نزدیک اس کا سنت طریقہ ایک بار ختم کرنا ہے، لوگ سستی کریں تو اس کو ترک نہیں کرے گا۔ اسکے برخلاف تشہد کے بعد کی دعائیں ترک کر سکتا ہے، کہ وہ مسنون نہیں، رمضان کے علاوہ وتر باجماعت نہیں پڑھے گا۔ اسی پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔

فتح القدیر علی الهدایہ میں ہے:

رہا حضرت عمر کے دور سے اس کا آغاز جیسا کہ عبدالرحمٰن بن عبد قاری سے مروی ہے کہ میں حضرت عمر کے ساتھ نکلا....'' الخ

پھر انھوں نے کہا: اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: میری سنت اور میرے بعد میرے خلفائے راشدین کی سنت کی پابندی کرو۔'' ایک دوسری حدیث میں فرمایا: اللہ نے اس کے روزہ کو فرض کیا، اور میں نے اس کے قیام کو مسنون کیا۔'' اور حضور ﷺ نے تراویح ترک کرنے کا عذر یہ بیان کر دیا کہ فرضیت کا اندیشہ ہے، اور انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث نقل کی: ''رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں نماز پڑھی، کچھ لوگوں نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی، پھر اگلی رات کو پڑھی، تو لوگوں کی کثرت ہوگئی،....'' الحدیث

حضرت عائشہ کی یہ حدیث نقل کی: حضور ﷺ رمضان غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔''

پھر کہا: ہاں بیس رکعت کا ثبوت حضرت عمرؓ کے زمانہ سے مؤطا میں یزید بن رومان کی روایت سے ہے، جس میں ۲۳ رکعات کا ذکر ہے، اور حضرت سائب بن یزید کی روایت میں ہے، بیس رکعات اور وتر۔ موطا میں گیارہ رکعت کی بھی روایت ہے۔ پھر انھوں نے کہا: ان دونوں روایتوں میں تطبیق کی شکل یہ ہے کہ پہلے گیارہ رکعت کا معمول تھا، پھر بیس رکعت کا مستقل معمول بن گیا، کیوں کہ تسلسل کے ساتھ یہی مروی ہے۔

پھر کہا حاصل یہ ہے کہ قیام رمضان گیارہ رکعات وتر کے ساتھ با جماعت مسنون ہے۔ حضور ﷺ نے اس کو کیا ہے، پھر اس کو ترک کر دیا، اور یہ عذر بتا دیا کہ اگر اس کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں پابندی کے ساتھ تم کو پڑھاتا، اور بلا شبہ آپ کی وفات کے بعد یہ اندیشہ جاتا رہا، لہٰذا سنت ہوگی، اور خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ خود حضور ﷺ کی سنت ہو۔ اس لیے کہ آپ ﷺ کی سنت وہ ہے جس پر آپ نے خود مواظبت کی ہو، یا کوئی عذر نہ ہو، اور اس عذر کو معدوم مانا جائے، ہم کو صرف یہی معلوم

ہے کہ آپ نے اس امر پر مواظبت کی، جو آپ سے صادر ہوا اور اس کا ذکر کیا جا چکا ہے، لہٰذا بیس مستحب ہوں گی، جس میں سابقہ مقدار ہی سنت ہوگی، جیسا کہ عشاء کے بعد چار رکعت مستحب ہیں، جن میں دو رکعت ہی سنت ہیں۔

مشائخ کے کلام کا ظاہر یہ ہے کہ سنت بیس رکعت ہے، حالانکہ دلیل کا تقاضا وہی ہے، جو ہم نے لکھا، لہٰذا اس صورت میں اولیٰ اور بہتر وہی قدوری ہی کے الفاظ ہوں گے،: ''مستحب ہے''، نہ کہ مصنف نے جو عبارت لکھی ہے، وہ ہوگی۔

پھر انھوں نے اس کی کیفیت اور اس کی ادائیگی کے طریقہ پر بحث کرتے ہوئے کہا:
مصنف کا قول: دو ترویحہ کے درمیان بیٹھنے میں مستحب ایک ترویحہ کے بقدر ہے، اسی طرح پانچویں ترویحہ اور وتر کے درمیان۔ انہوں نے کہا: انھوں نے اہل حرمین کے معمول سے استدلال کیا ہے۔ اہل مدینہ اس کے بدلہ چار رکعات تنہا تنہا پڑھتے تھے، اہل مکہ ان دونوں کے درمیان سات چکر طواف کرتے تھے، اور دو رکعات طواف کی پڑھتے تھے۔ بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے: لوگ عہد عمر میں قیام کرتے تھے۔

ہم منع نہیں کرتے کہ کوئی جتنی چاہے نفلیں پڑھے، ہاں گفتگو جماعت کے ساتھ مستحب مقدار کے بارے میں ہے، اور ہر شہر والوں کو اختیار ہے کہ تسبیح پڑھیں، **لا الٰہ الا اللّٰہ** پڑھیں، خاموش رہ کر انتظار کریں، یا تنہا تنہا چار رکعات پڑھ لیں اور انتظار کرنا مستحب اسی لئے ہے کہ تراویح ''راحت'' سے ماخوذ ہے، لہٰذا اس کے نام کی رعایت میں ترویحہ ہوگا، اور یہی تسلسل کے ساتھ منقول ہے۔

قرأت: اس کے بارے میں انھوں نے کہا: مصنف کا قول: اکثر مشائخ رحمہم اللہ کی رائے ہے کہ ایک بار ختم کرنا ہے، لوگوں کے سستی کرنے کے سبب ترک نہ کرے۔ انھوں نے کہا اکثر کے بالمقابل یہ قول ہے: مغرب میں قرأت کے بقدر پڑھنا افضل ہے، اس لیے کہ نوافل کی بنیاد تخفیف پر ہے، خصوصاً با جماعت کی صورت میں۔

ایک قول: ہر رکعت میں تیس آیات پڑھے، اس لیے کہ حضرت عمر نے یہی حکم دیا تھا

تو تین بار ختم ہوجائے گا۔اس لیے کہ ہر عشرہ کی مستقل فضیلت ہے،جیسا کہ روایت میں ہے کہ اول عشرہ رحمت، بیچ والا عشرہ مغفرت، اور اخیر عشرہ جہنم سے آزادی کا ہے۔ کچھ حضرات کے نزدیک ۲۷ویں کو ختم کرنا مستحب ہے تاکہ شب قدر کی فضیلت ملنے کی امید ہوجائے، پھر اگر اخیر عشرہ سے قبل قرآن ختم کرلے تو ایک قول ہے: بقیہ راتوں میں تراویح ترک کردینا مکروہ نہیں۔ دوسرا قول ہے: تراویح پڑھتا رہے۔ البتہ جو چاہے قرأت کرے، اکثر کی رائے جس کو حسن نے امام ابوحنیفہؒ سے روایت کیا ہے یہ ہے کہ ہر رکعت میں دس آیات پڑھے، لہٰذا تراویح کی تعداد چھ سو رکعات یا پانچ سو اسی رکعات ہوگی۔ (یہ اس طرح کہ کل آیاتِ قرآنی تقریباً چھ ہزار ہیں، اگر دس آیات کے قریب ایک رکعت میں پڑھا جائے تو روزانہ ۲۰/ رکعات کے حساب سے ۳۰/ یا ۲۹/ راتوں میں چھ سو یا پانچ سو اسّی رکعات ہوں گی)

قرآن کی آیات کی تعداد: چھ ہزار سے کچھ زائد ہے، بعض نے حسن سے یہ قول نقل کیا ہے: دس آیات وغیرہ اور یہ بہتر ہے۔ امام ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ وہ ۶۱/ ختم کرتے تھے، ہر دن ایک ختم، ہر رات ایک ختم، اور پوری تراویح میں ایک ختم اور اس کو یعنی ختم قرآن کو لوگوں کی سستی کے سبب ختم نہ کرے، اس لیے کہ اس میں لوگوں کے لیے طوالت نہیں، بلکہ تخفیف ہے۔

اگر اپنے محلّہ کی مسجد کا امام ختم قرآن نہ کرتا ہو تو دوسرے امام کے پیچھے پڑھنے کے لیے اس کو چھوڑ سکتا ہے۔ (یعنی یہاں پر احناف کی بات پوری ہوگئی)

خلاصہ:

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ احناف کا مسلک حسب ذیل ہے:

اول: تراویح سنت ہے، گیارہ رکعات سنت، اور بقیہ بیس رکعات تک مستحب ہے، وتر اس سے الگ ہے۔

دوم: ہر ترویحہ کے بعد انتظار کرنا مستحب ہے، اور اس انتظار کے دوران ہر شہر والوں کو اختیار ہے جو چاہے کریں۔

سوم: تراویح میں کم از کم ایک بار ختم ہونا چاہیے۔
چہارم: جماعت تراویح افضل ہے۔
پنجم: وتر مسجد میں با جماعت افضل ہے، یا گھروں میں تنہا تنہا؟ مختلف فیہ ہے قاضی خاں کے یہاں راجح اول ہے۔

مذہب شافعی:

امام شافعی نے کتاب الام (۱۴۲/۱) میں فرمایا: رہا قیام رمضان انفرادی طور پر نماز پڑھنے والے کی نماز میرے نزدیک زیادہ پسند ہے، میں نے مدینہ میں لوگوں کو ۳۹ رکعات پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، میرے نزدیک پسندیدہ بیس رکعات ہے، اسلئے کہ یہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ مکہ میں اتنی ہی رکعات پڑھتے ہیں۔''

امام صاحب کے قول: انفرادی طور پر پڑھنے والے کی نماز ...'' سے یہ وہم ہوتا ہے کہ ان کی مراد ''تراویح انفرادی طور پر پڑھنے والے کی نماز'' لیکن مزنی نے اس سے امام شافعی کی مراد کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ ان کی مراد: وہ نوافل ہیں جو با جماعت کے بجائے تنہا تنہا پڑھی جاتی ہیں'' مثلاً سنن رواتب اور وتر، یہاں پر امام شافعی قیام رمضان اور بقیہ نوافل کے درمیان موازنہ ومفاضلہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس توجیہ کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ انھوں نے احب الی منہ میں ضمیر مذکر استعمال کی ہے۔

نیز اس کی تائید آغاز بحث میں ان کے اس قول سے ہوتی ہے: تطوع دو طرح کے ہیں:

اول: با جماعت موکد نماز جس کو ان کی ادائیگی کی قدرت ہو، میں اس کیلئے اس کے ترک کرنے کو جائز نہیں سمجھتا، اور اس میں سے عیدین کی نماز ہے.... الخ

دوم: انفرادی طور پر پڑھی جانے والی نمازیں، ان میں سے بعض کی بمقابلہ بعض تاکید زیادہ ہے، چنانچہ سب سے مؤکد وتر ہے، اور تہجد کی نماز بھی اس کے مشابہ ہوسکتی ہے، اس کے بعد فجر کی دو رکعتیں ہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: میں کسی مسلمان کو رخصت نہیں دیتا

کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی ترک کرے، گو کہ میں ان کو واجب نہیں کہتا، جس نے ان دونوں میں سے کسی ایک کو ترک کر دیا، اس کی حالت تمام نوافل ترک کرنے والے کی حالت سے بدتر ہے۔ پھر فرمایا: رہا قیام رمضان تو انفرادی طور پر پڑھنے والے کی نماز میرے نزدیک اس سے زیادہ پسندیدہ ہے، یعنی فجر کی دو رکعتوں سے۔اور وتر امام صاحب کے نزدیک بمقابلہ قیام رمضان مؤکد ہے۔

نوویؒ المجموع (۳۰/۴) میں مسلک کی تفصیل کرتے ہوئے لکھا ہے: ''مصنف نے فرمایا: سنن راتبہ میں سے: قیام رمضان ہے، جو بیس رکعت دس سلاموں کے ساتھ ہیں۔ اس کی دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ قیام رمضان کی ترغیب دیتے تھے، لیکن عزیمت کے ساتھ حکم نہ تھا، آپ فرماتے تھے: جس نے ایمان کے ساتھ اور احتساب کیساتھ قیام رمضان کیا، اس کے پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔''

افضل با جماعت ادا کرنا ہے، بویطی نے اس کی تصریح کی ہے، اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پیچھے جمع کر دیا تھا۔ ہمارے بعض اصحاب کا کہنا ہے: اس کو تنہا تنہا پڑھنا افضل ہے، اس لیے کہ حضور ﷺ نے چند راتوں کو پڑھا، لوگوں نے بھی آپ کے پیچھے پڑھا، پھر آپ نے رک کر گھر میں باقی راتوں کو ادا کیا، لیکن مذہب پہلا ہے، حضور ﷺ کے رکنے کی واحد وجہ فرضیت کا اندیشہ تھا۔ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''مجھے اندیشہ ہوا کہ تم پر فرض ہو جائے اور تم اس کو ادا نہ کر سکو۔''

امام بغوی نے فرمایا: (شرح) حضرت ابو ہریرہ کی حدیث مسلم نے انہی الفاظ میں اور بخاری نے اختصار کے ساتھ نقل کی اور حضرت عمر کا لوگوں کو حضرت ابی کے پیچھے جمع کرنا صحیح ہے، اس کو بخاری نے روایت کیا ہے، دو اور احادیث: اول: حضور ﷺ نے چند راتوں کو اسے ادا کیا۔ کچھ لوگوں نے آپ کے پیچھے ادا کیا پھر آپ رک گئے۔ دوسری: مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر فرض ہو جائے ان دونوں کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ ان کا فرمان: ''لیکن عزیمت کے ساتھ حکم نہ تھا'' یعنی آپ نے اس کو لازم نہیں کیا، ہاں فضائل کے ذکر نے کے ذریعہ

ترغیب ودعوت تھی۔ ''ایمان کے ساتھ'' یعنی اس کی حقانیت کی تصدیق کے ساتھ۔

''احتساب کے ساتھ'' یعنی اللہ کی رضا کے لئے ہو، ریا کاری مقصود نہ ہو۔ رہا مسئل کا حکم تو تراویح با جماعت سنت ہے۔ ہمارا مذہب ہے کہ بیس رکعات دس سلاموں کے ساتھ ہے۔ انفرادی طور پر اور با جماعت جائز ہے، ان میں کون افضل ہے؟ اس سلسلہ میں دو مشہور ''وجہیں'' ہیں، جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے۔ ایک جماعت نے اسے ''دوقول'' قرار دیا ہے، (صحیح) باتفاق اصحاب یہ قول ہے کہ باجماعت افضل ہے، ''بویطی'' میں اسی کی تصریح ہے، اور یہی اکثر متقدمین اصحاب کا قول ہے، (دوم) انفرادی طور پر افضل ہے۔ مصنف ان دونوں کی دلیلیں لکھ چکے ہیں، ہمارے عراقی اصحاب اور خراسانی اصحاب میں سے صیدلانی اور بغوی وغیرہ نے کہا، اختلاف اس شخص کے بارے میں ہے، جو حافظ قرآن ہو، اور انفرادی طور پر ادا کرنے کی صورت میں کاہلی آنے کا اسکوڈر نہ ہو، اور اس کے پیچھے رہنے سے جماعت میں خلل وانتشار نہ ہو اور اگر ان میں سے کوئی بھی امر مفقود ہو بلا اختلاف بلا جماعت افضل ہے۔ (آگے لکھا ہے) ابوالعباس اور ابواسحاق نے کہا: با جماعت نماز تراویح تنہا پڑھنے سے افضل ہے، اسلئے کہ اس پر صحابہ کرام اور اہل امصار کا اجماع ہے۔

پھر کہا: (تفریع) تراویح کا وقت، نماز عشاء سے فراغت کے بعد سے داخل ہو جاتا ہے، اس کو بغوی وغیرہ نے لکھا ہے، اور طلوع فجر تک رہتا ہے، دو دو رکعات پڑھنا چاہیے جیسا کہ معمول ہے، لہٰذا اگر ایک سلام سے چار رکعات پڑھے تو صحیح نہیں، اس کو قاضی حسین نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے؛ اس لیے کہ یہ خلاف مشروع ہے، اور مطلق نیت سے صحیح نہیں، سنت تراویح یا نماز تراویح یا قیام رمضان کی نیت کرنی ہوگی، تراویح کی ہر رکعت پر نیت کرے گا۔

کہا: (تفریع): رکعات کی تعداد کے بارے میں علماء کے مذاہب: ہمارا مذہب ہے: بیس رکعات دس سلام سے ہوگی، وتر الگ ہے، ان میں پانچ ترویحے ہوں گے، ہر ترویحہ چار رکعات کا دو سلام کے ساتھ ہوگا۔

یہی ہمارا مذہب ہے، اسی کے قائل: امام ابوحنیفہ، ان کے اصحاب، امام احمد اور داؤد وغیرہ ہیں، قاضی عیاض نے اس کو جمہور علماء سے نقل کیا ہے، منقول ہے کہ اسود بن یزید چالیس رکعات تراویح اور سات رکعات وتر پڑھتے تھے، امام مالکؒ نے کہا: تراویح نو ترویحہ ہیں، جو وتر کے علاوہ چھتیس رکعات ہوتی ہیں۔ انھوں نے اہل مدینہ کے عمل سے استدلال کیا ہے، اور نافع سے منقول ہے کہ میں نے لوگوں کو رمضان میں ۳۹ ررکعات تراویح اور تین رکعات وتر پڑھتے ہوئے پایا۔

ہمارے اصحاب کا استدلال بیہقی وغیرہ میں باسناد صحیح حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کے اس قول سے ہے کہ لوگ عہد فاروقی میں رمضان میں بیس بیس رکعات ادا کرتے تھے، مئین پڑھتے تھے، اور طول قیام کے سبب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں لاٹھیوں کے سہارے کھڑے ہوتے تھے۔

یزید بن رومان نے کہا: لوگ حضرت عمرؓ کے دور میں ۲۳ رکعات پڑھتے تھے۔ (رواہ مالک فی الموطا عن یزید بن رومان) اس کو بیہقی نے بھی روایت کیا ہے، لیکن یہ مرسل ہے، اس لیے کہ یزید بن رومان نے حضرت عمر کو نہیں پایا ہے، بیہقی نے کہا: دونوں روایتوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ بیس رکعات تراویح اور تین رکعات وتر پڑھتے تھے، بیہقی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیس رکعات قیام رمضان نقل کیا ہے۔

جہاں تک اہل مدینہ کے عمل کی بات ہے، تو ہمارے اصحاب نے کہا: اس کا سبب یہ ہے کہ اہل مکہ ہر دو ترویحہ کے درمیان ایک طواف کرتے ان کی برابری کرنے کے ارادے سے ہر طواف کے بدلے چار رکعات مقرر کر لی، اور ۱۶ رکعات کا اضافہ کر لیا، تین رکعات وتر پڑھتے تھے، اس طرح کل ۳۹ رکعات ہوگئیں، واللہ اعلم۔

پھر کہا: (تفریع) الشامل البیان وغیرہ کے مؤلفین نے کہا ہمارے اصحاب نے کہا اہل مدینہ کے علاوہ دوسروں کے لیے تراویح میں اہل مدینہ کے عمل کو اختیار کرنا صحیح نہیں، کہ وہ بھی ۳۶ ررکعات پڑھیں۔ اس لیے مدینہ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت گاہ اور مدفن ہونے کے

سبب وہاں کے لوگوں کو جو شرف حاصل ہے، دوسرے اس سے محروم ہیں۔ قاضی ابوطیب نے اپنی تعلیق میں کہا کہ امام شافعی نے فرمایا: مدینہ کے علاوہ دوسری جگہوں کے لوگ اہل مکہ کا مقابلہ ومنافسہ کریں جائز نہیں۔

پھر کہا: (تفریع) تراویح میں سلف کیا پڑھتے تھے: امام مالک نے مؤطا میں داؤد بن حصین سے انھوں نے عبدالرحمٰن بن اعرج سے نقل کیا کہ میں نے لوگوں کو اس وقت پایا، جب کہ وہ رمضان میں کفار پر لعنت بھیج رہے تھے۔ انھوں نے کہا: قاری سورہ بقرہ آٹھ رکعات میں پڑھتا تھا، اگر بارہ رکعات میں پڑھتا تو لوگ سمجھتے کہ اس نے تخفیف کردی، امام مالک ہی نے عبداللہ بن ابوبکر سے نقل کیا ہے کہ میں نے اپنے والد کو یہ کہتے ہوئے سنا: ہم رمضان میں قیام کے بعد لوٹتے تو خادموں سے جلدی جلدی سحری مانگتے تھے کہ کہیں فجر طلوع نہ ہو جائے، امام مالک نے محمد بن یوسف سے انھوں نے سائب بن یزید سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم داری کو حکم دیا کہ لوگوں کو قیام رمضان کرائیں، قاری صاحب ''مئین'' پڑھتے تھے۔ حتیٰ کہ طول قیام کے سبب ہم لاٹھیوں کا سہارا لیتے تھے، اور فجر ہوتے ہوتے ہی ہم لوٹتے تھے۔ بیہقی نے اپنی سند سے ابوعثمان ہندی کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت عمر نے تین قراء کو بلایا، پڑھوا کر سنا، سب سے تیز پڑھنے والے کو تیس آیات میانہ رَو قاری کو پچیس آیات اور سب سے آہستہ پڑھنے والے کو بیس آیات پڑھنے کا حکم دیا۔

پھر کہا: (تفریع): عروہ بن زبیر سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو قیام رمضان پر جمع کر دیا: مردوں کو ابی بن کعب کے پیچھے اور عورتوں کو سلیمان بن ابوحثمہ کے پیچھے لگایا۔ عرفجہ ثقفی سے ان کا یہ قول مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں کو قیام رمضان کا حکم دیتے تھے، مردوں کے لیے ایک امام، اور عورتوں کے لئے ایک الگ امام مقرر کیا تھا، میں عورتوں کا امام تھا۔ (**رواهما البیهقی**)

پھر کہا: (تفریع): ہم لکھ چکے ہیں کہ ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ انفرادی طور پر پڑھنے کے مقابلہ میں باجماعت تراویح پڑھنا افضل ہے، یہی جماہیر علماء کا قول ہے۔ حتیٰ علی

بن موسیٰ قمی نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ ربیعہ، مالک اور ابو یوسف وغیرہ نے کہا: تنہا تنہا پڑھنا افضل ہے۔ ہماری دلیل با جماعت پڑھنے پر صحابہ کا اجماع ہے جو گذر چکا۔ یہاں مصنف نے تنہا تنہا پڑھنے کے قائل حضرات کی دلیل ذکر نہیں کی، حالانکہ ذکر کر دینا بہتر تھا۔ ان کی دلیل یہ فرمان نبوی ہے ''نماز اپنے گھروں میں پڑھو اس لیے کہ فرض کے علاوہ آدمی کی اپنے گھر میں نماز سب سے افضل ہے۔'' اور حضرت ابی ﷺ کے پیچھے لوگوں کو نماز پڑھتے دیکھ کر حضرت عمر کا یہ قول ہے: جس حصہ میں تم سو جاتے ہو، وہ افضل ہے، یعنی اخیر شب کی نماز۔

لیکن با جماعت کے قائلین کے نزدیک راجح اور ان کے قول کے لیے مرجح، جیسا کہ نووی نے اس کو نقل کیا ہے: صحابہ کرام کا عمل، اور آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے والوں، اور مزید اخیر رات نفل پڑھانے کے ان کے مطالبہ کی حضور ﷺ کی طرف سے تقریر ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی اس طرح کی چیزیں ہیں جس سے ایک دوسرے کو تقویت ملتی ہے۔

مذہب حنابلہ:

المغنی (۱/۱۶۶،۱۷۳) میں ہے:

(مسئلہ) انھوں نے کہا: ماہ رمضان کا قیام (یعنی تراویح) بیس رکعات ہے، یہ سنت مؤکدہ ہے، سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے اس کو مسنون فرمایا، حضرت ابو ہریرہ ؓ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ قیام رمضان کی ترغیب دیتے تھے، لیکن عزیمت کے ساتھ حکم نہ تھا، آپ فرماتے تھے:

جس نے ایمان واحتساب کے ساتھ قیام رمضان کیا، اس کے پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔''

اور حضرت عائشہ ؓ نے فرمایا: حضور ﷺ نے ایک رات مسجد میں نماز پڑھی، کچھ لوگوں نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی، پھر اگلی رات آپ نے نماز پڑھی، لوگ بہت زیادہ آ گئے تھے۔ پھر تیسری اور چوتھی رات لوگ جمع ہوئے تو حضور ﷺ نہیں نکلے، صبح کو آپ نے فرمایا:

''میں نے تمہارے ساتھ اجتماع دیکھا، اور مجھے نکلنے سے صرف یہ اندیشہ مانع ہوا کہ تم پر فرض نہ ہو جائے۔ راوی نے کہا: یہ رمضان کا واقعہ ہے۔'' (**رواهما مسلم**)

۲۔ حضرت ابو ذرؓ نے کہا: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رمضان کا روزہ رکھا، کسی رات آپ نے ہمارے ساتھ ''قیام'' نہیں فرمایا: سات راتیں رہ گئیں، تو آپ نے ہمارے ساتھ ''قیام'' فرمایا: جو تہائی رات تک جاری رہا، چھٹی رات رہ گئی تو آپ نے قیام نہیں فرمایا، پانچویں رات رہ گئی تو آپ نے قیام فرمایا، جو نصف شب تک جاری رہا، میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! کاش آپ پوری رات ''قیام'' فرما دیتے؟ جب چوتھی رات رہ گئی تو آپ نے قیام نہیں فرمایا تیسری رات رہ گئی تو اپنے اہل وعیال اور لوگوں کو جمع فرمایا، اور پھر مہینہ کی بقیہ راتوں میں ہمارے ساتھ قیام فرمایا۔'' (رواہ ابوداؤد والاثرم وابن ماجہ)

۳۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: حضور ﷺ باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ مسجد کے ایک گوشہ میں رمضان میں نماز پڑھ رہے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا یہ کیا کر رہے ہیں؟ بتایا گیا کہ ان لوگوں کو قرآن حفظ نہیں، حضرت ابی رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے ہیں اور یہ لوگ ان کی اقتداء میں پڑھ رہے ہیں، آپ نے فرمایا: ٹھیک کیا اور کیا خوب کیا! (رواہ ابوداؤد)

انھوں نے کہا: اس کو مسلم بن خالد نے روایت کیا، جو ضعیف ہے، تراویح حضرت عمر بن خطابؓ سے اس لئے منسوب ہے کہ انھوں نے لوگوں کو ابی بن کعب کے پیچھے جمع کر دیا تھا، اور وہ ان کو تراویح پڑھاتے تھے۔

عبدالرحمٰن بن عبد قاری نے کہا: میں حضرت عمر بن خطاب کے ساتھ ایک رات نکلا، لوگوں کو متفرق طور پر، لوگوں کو الگ الگ نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ کوئی تنہا پڑھ رہا ہے تو کسی کے پیچھے چند لوگ پڑھ رہے ہیں، حضرت عمر نے فرمایا: میں سمجھتا ہوں کہ اگر سب کو ایک قاری کے پیچھے جمع کر دوں، تو زیادہ اچھا تھا، پھر اس کا عزم کر کے سب کو حضرت ابی بن کعب کے پیچھے جمع کر دیا۔

راوی نے کہا: پھر میں ایک اور رات اور ان کے ساتھ نکلا، تو لوگ قاری کے پیچھے

پڑھ رہے تھے، حضرت عمر نے فرمایا: کیا خوب نئی چیز ہے یہ!! جس کو چھوڑ کر تم سو جاتے ہو وہ اس سے بہتر ہے، جس کو پڑھتے ہو، یعنی اخیر شب! لوگ ابتدائی رات میں تراویح پڑھ لیتے تھے۔'' (بخاری)

فصــــل

اس میں ابوعبداللہؒ کے نزدیک مختار: بیس رکعات ہے، یہی ثوری، ابوحنیفہ اور شافعی کا قول ہے، امام مالک نے فرمایا: ۳۶ رکعات ہیں، ان کا خیال ہے کہ یہی پرانا معمول ہے، ان کا استدلال اہل مدینہ کے عمل سے ہے، تو اُمہ کے آزاد کردہ غلام صالح نے کہا: میں نے لوگوں کو ۴۱ رکعات پڑھتے ہوئے پایا، جن میں پانچ رکعات وتر ہیں۔'' اور ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب کے پیچھے لوگوں کو جمع کیا، تو ان کو بیس رکعات پڑھاتے تھے، حسن کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو حضرت ابی بن کعب کے پیچھے جمع کیا، وہ انھیں بیس رکعات پڑھاتے تھے، اور صرف نصف ثانی میں قنوت پڑھتے تھے، جب اخیر عشرہ آتا تو حضرت ابی رک کر اپنے گھر میں نماز پڑھنے لگتے، اور لوگ کہنا شروع کردیتے: ابی بھاگ گئے۔ (رواہ ابوداؤد) اور اس کو سائب بن یزید نے روایت کیا، اور ان سے متعدد طرق سے مروی ہے کہ امام مالک نے یزید بن رومان کا قول نقل کیا ہے: لوگ حضرت عمر کے زمانے میں رمضان میں بیس رکعات تراویح پڑھتے تھے۔

یہ اجماع کی طرح ہے، رہی صالح کی روایت تو ضعیف ہے، پھر یہ معلوم نہیں کی لوگوں کے حوالہ سے خبر دی؟ شاید اس نے کچھ لوگوں کو ایسا کرتے ہوئے پایا ہو، لیکن یہ حجت نہیں، پھر اگر یہ ثابت ہو جائے کہ تمام اہل مدینہ کا اجماع ہے تو حضرت عمر کا فعل اور ان کے دور میں صحابہ کا اجماع اتباع کے زیادہ لائق ہے۔ بعض اہل علم نے کہا: اہل مدینہ کا یہ عمل محض اس وجہ سے تھا کہ وہ اہل مکہ کی برابری کرنا چاہتے تھے، کیوں کہ اہل مکہ ہر دو ترویحہ کے درمیان ایک مکمل طواف کرتے تھے، تو اہل مدینہ نے ہر طواف کی جگہ چار رکعات مقرر کرلیں، صحابۂ رسول ﷺ کے عمل کی اتباع زیادہ ضروری اور لائق ہے۔

ابوعبداللہ کے یہاں مختار باجماعت تراویح ہے، انھوں نے یوسف بن موسیٰ کی روایت میں کہا: تراویح میں جماعت افضل ہے۔ اگر کوئی قابل اقتداء شخص گھر میں پڑھے تو مجھے اندیشہ ہے لوگ بھی اس کے نقش قدم پر چلیں گے، اور حضور ﷺ سے مروی ہے: ''خلفاء کی اقتداء کرو۔'' حضرت عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ باجماعت پڑھتے تھے مزنی، ابن عبدالحکم اور اصحاب ابی ابوحنیفہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ امام احمد نے فرمایا: حضرت علی، جابر، اور عبداللہ باجماعت پڑھتے تھے۔ طحاوی نے کہا: جو انفرادی طور پڑھنا پسند کرے تو اس انداز سے چاہیے کہ مسجد کی تراویح بند نہ ہو جائے، اگر انفرادی طور پر پڑھنے سے مسجد کی تراویح بند ہو جائے تو درست نہیں۔ تقریباً یہی لیث سے منقول ہے۔ امام مالک و شافعی نے فرمایا: قیام رمضان اس شخص کے لیے جو گھر میں ادا کر سکے، ہمارے نزدیک زیادہ پسند ہے۔ اس لئے کہ زید بن ثابت کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے کھجور کے پتوں یا چٹائی کا ایک کمرہ بنایا، حضور ﷺ اس میں تشریف لے گئے، اور آپ کے پیچھے کچھ لوگ گئے، راوی نے کہا: لوگ ایک رات پھر آ گئے، حضور ﷺ نے دیر کر دی، باہر نہیں نکلے، لوگوں نے آواز بلند کی، دروازے پر کنکری ماری، حضور ﷺ ناراض باہر تشریف لائے، فرمایا تم یہی کرتے رہے، حتیٰ کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ تم پر فرض کر دی جائے گی۔ لہٰذا تم اپنے گھروں میں نماز پڑھنے کا اہتمام کرو۔ فرض نماز کے علاوہ، آدمی کی سب سے عمدہ نماز گھر میں ہے۔'' (رواہ مسلم)

ہماری دلیل: اس پر صحابہ کا اجماع ہے، حضرت ابوذر کی روایت میں: حضور ﷺ کا صحابہ کرام اور اپنے اہل کو جمع کرنا، اور آپ کا یہ فرمانا: اگر لوگ امام کے ساتھ نماز پڑھتے رہیں، یہاں تک کہ وہ لوٹ جائے، تو ان کے لیے اس رات کے قیام کا ثواب لکھ دیا جاتا ہے، یہ خاص قیام رمضان کے بارے میں ہے، لہٰذا اس کو ان حضرات کے مستدلات کے عموم پر مقدم کیا جائے گا، اور حضور ﷺ کا ان سے یہ فرمانا اس کی علت اندیشۂ فرضیت ہے، اور اسی وجہ سے آپ ﷺ نے یہی وجہ بیان کرتے ہوئے اس کو ترک کر دیا، یا اس اندیشہ سے کہ لوگ اس کو فرض بنا لیں گے، اور آپ ﷺ کے بعد ایسا کرنے کا اندیشہ نہیں رہا، اگر یہ

اعتراض ہو کہ حضرت علی نے صحابہ کے ساتھ تراویح نہیں پڑھی؟ تو ہم کہیں گے کہ ابوعبداللہ سلمی سے مروی ہے کہ حضرت علی نے ان کو رمضان میں تراویح پڑھائی، اور اسماعیل بن زیاد نے کہا: حضرت علیؓ رمضان میں مساجد میں گزرے، قندیلیں لگی ہوئی تھیں، فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت عمرؓ کی قبر کو روشنی سے بھر دے، جیسا کہ انھوں نے ہماری مساجد کو روشن کر دیا۔ (رواہما الاثرم والمروزی)

فصل

امام احمد نے فرمایا: رمضان میں لوگوں کے ساتھ اتنی قرأت کرے، جس میں ان کے لیے سہولت رہے، دشواری نہ ہو، خصوصاً چھوٹی راتوں میں۔ لوگوں کے لیے برداشت تک ہی رہنا چاہیے۔ قاضی نے کہا: مہینہ میں ایک ختم سے کم کرنا مستحب نہیں، تاکہ لوگ پورا قرآن سن لیں، اور ایک سے زیادہ ختم نہ کرے کہ کہیں مقتدیوں کو دشواری نہ ہو، لوگوں کی حالت کی رعایت کرنا اولیٰ ہے، جیسا کہ حضرت ابوذر کی روایت میں ہے: ہم نے حضور کے ساتھ تراویح اتنی دیر تک پڑھی کہ فلاح یعنی سحری چھوٹنے کا اندیشہ ہونے لگا۔

سلف لمبی نماز پڑھتے تھے، حتیٰ کی بعض کا کہنا ہے: جب وہ لوٹتے تو فجر طلوع ہونے کے اندیشہ سے، خدام سے جلدی جلدی کھانا مانگتے تھے۔ قاری ''مـئیـن'' پڑھتا تھا، ابوداؤد نے کہا: میں نے امام احمد کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے، مجھے پسند ہے کہ امام کے ساتھ (تراویح) اور وتر پڑھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: '' آدمی اگر امام کے ساتھ نماز پڑھتا رہے، یہاں تک کہ وہ لوٹ جائے تو اس کے لیے بقیہ رات کا ثواب لکھ دیا جاتا ہے۔ امام احمد لوگوں کے ساتھ تراویح اور وتر پڑھتے تھے، اثرم نے کہا مجھے رات میں امام احمد کے امام نے بتایا کہ وہ ان کے ساتھ پوری وتر اور تراویح پڑھتے تھے، اس نے بتایا کہ لوگ اس کے بعد میرا انتظار کرتے، جب میں اٹھ جاتا تو لوگ اٹھ جاتے، غالباً وہ حضرت ابوذر کی اس حدیث کو مدنظر رکھتے تھے۔ جو امام کے ساتھ نماز پڑھے یہاں تک کہ وہ لوٹ جائے، تو اس کے لیے بقیہ رات کا ثواب لکھ دیا جاتا ہے۔''

امام ابوداؤد نے کہا: امام احمد سے دریافت کیا گیا: کچھ لوگوں نے رمضان میں پانچ ترویحہ پڑھا، لیکن دو ترویحہ کے درمیان آرام نہیں کیا؟ فرمایا کوئی حرج نہیں، انھوں نے کہا: اوران سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص کو ایک ترویحہ کی دو رکعتیں ملیں، تو کیا اس کے ساتھ دو رکعات ملائے گا؟ تو انھوں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی اور فرمایا: یہ نفل ہے، اور امام احمد سے پوچھا گیا قیام مؤخر کریں؟ یعنی تراویح کو اخیر رات میں پڑھیں؟ فرمایا نہیں، مسلمانوں کا طریقہ میرے نزدیک زیادہ پسند ہے۔

تراویح کے دوران نفل:

ابوعبداللہ نے تراویح کے دوران نفل کو مکروہ کہا ہے، اور کہا اس سلسلے میں تین صحابہ کرام: عبادہ، ابودرداء اور عقبہ بن عامر سے منقول ہے:

ابوعبداللہ سے کہا گیا کہ بعض صحابہ سے اس سلسلے میں رخصت منقول ہے؟ فرمایا: یہ باطل ہے۔ ہاں اس سلسلے میں حسن وسعید بن جبیر سے منقول ہے۔ امام احمد نے فرمایا: فرض کے بعد نفل پڑھے، تراویح کے دوران نفل نہ پڑھے۔

اثرم کی روایت ہے کہ حضرت ابودرداء نے کچھ لوگوں کو دوران تراویح نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا: یہ کون سی نماز ہے، کیا امام تمہارے سامنے ہو، تب بھی تم نماز پڑھو گے؟ جو ہم سے اعراض کرے وہ ہم سے نہیں، اور فرمایا: آدمی کی قلت فقہ کی علامت ہے کہ مسجد میں دیکھا جائے اور نماز میں نہ ہو۔"

فصل

رہی تعقیب: یعنی تراویح کے بعد کوئی اور نفل باجماعت پڑھے، یا دوسری جماعت کے ساتھ تراویح پڑھے۔

تو امام احمد سے منقول ہے: اس میں کوئی حرج نہیں، اس لیے کہ حضرت انس بن مالک نے فرمایا:

''وہ کسی خیر کی امید یا کسی شر سے بچنے ہی کی خاطر لوٹتے ہیں۔''اس میں وہ کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔

محمد بن حکم نے ان سے ''کراہت'' نقل کی ہے،لیکن یہ قدیم قول ہے،عمل، جماعت کی روایت پر ہے۔

ابوبکر نے کہا:''نصف یا اخیر رات تک نماز'' مکروہ نہیں،اس میں بس ایک روایت ہے۔ہاں اختلاف اس صورت میں ہے جب کہ سونے سے قبل لوٹ آئیں،صحیح یہ ہے کہ مکروہ نہیں۔اس لیے کہ یہ خیر اور عبادت ہے،لہٰذا مکروہ نہیں۔جیسا کہ اگر اخیر رات تک مؤخر کردے۔

ختم قرآن میں دعا اور ختم قرآن میں ہاتھوں کو اٹھانا:

فضل بن زیاد نے کہا:میں نے ابوعبداللہ سے پوچھا:میں قرآن ختم کررہا ہوں، اس کو وتر میں کروں یا تراویح میں؟فرمایا:تراویح میں تاکہ ہمیں دونوں کے دوران دعا مل جائے۔میں نے کہا:کیسے کروں؟فرمایا جب اخیر قرآن پڑھ لوتو رکوع سے قبل اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاؤ اور ہمارے ساتھ دعا کرو،ہم نماز میں ہوں گے،دیر تک کھڑے رہنا۔میں نے کہا کیا دعا کروں؟فرمایا:جو چاہے۔میں نے حسب حکم کیا۔وہ میرے پیچھے کھڑے ہاتھوں کو اٹھائے دعا مانگ رہے تھے۔

حنبل نے کہا:میں نے ختم قرآن کے بارے میں امام احمد کو یہ فرماتے ہوئے سنا، جب تم (قل اعوذ برب الناس) پڑھ لو،تو رکوع سے قبل دعا میں ہاتھوں کو اٹھاؤ۔میں نے پوچھا آپ کے پاس اس کا ماخذ ومرجع کیا ہے؟فرمایا:میں نے اہل مکہ کو ایسے ہی کرتے دیکھا ہے۔

سفیان بن عیینہ مکہ میں ان کے ساتھ اسی طرح کرتے تھے،عباس بن عبد العظیم نے کہا:اسی طرح کرتے ہوئے میں نے لوگوں کو بصرہ ومکہ مکرمہ میں پایا ہے اہل مدینہ اس کے بارے میں کچھ روایت کرتے ہیں۔یہ حضرت عثمان بن عفان سے مروی ہے۔

فصل

شک کی رات میں تراویح کے بارے میں ہمارے اصحاب کے درمیان اختلاف ہے۔قاضی سے منقول ہے کہ ہمارے شیخ ابوعبداللہ کے زمانہ میں یہ مسئلہ اٹھا تو انھوں نے تراویح پڑھی،اور قاضی ابویعلیٰ نے بھی پڑھی،اس لیے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر اس کا روزہ فرض کیا،اور میں نے اس کا قیام مسنون کیا۔'' حضور ﷺ نے قیام کو روزہ کے ساتھ رکھا۔

ابوحفص عکبری ترک تراویح کے قائل ہیں،اور انھوں نے فرمایا: روزہ کے بارے میں اعتماد،ابن عمر کی حدیث اور صحابہ وتابعین کے فعل پر ہے،اور اس رات تراویح ان سے منقول نہیں،تمیمی حضرات نے اسی کو اختیار کیا ہے،اس لئے کہ اصل: شعبان کا باقی ہونا ہے، ہم نے روزہ کا قول،واجب میں احتیاط کے مدنظر اختیار کیا ہے اور نماز (تراویح) واجب نہیں،لہٰذا وہ اصل پر برقرار رہے گی۔''

فصل

ابوطالب نے کہا: میں نے امام احمد سے دریافت کیا:''قل اعوذ برب الناس'' پڑھنے کے بعد، کچھ سورہ بقرہ پڑھے گا؟ فرمایا نہیں،انھوں نے بہتر نہیں سمجھا کہ ختم قرآن کے ساتھ کچھ قرأت ملا دے۔شاید اس سلسلہ میں ان کے نزدیک کوئی صحیح اثر نہیں،جس کو اختیار کریں۔

ابوداؤد نے کہا: میں نے امام احمد سے ابن مبارک کا یہ قول ذکر کیا: اگر جاڑا ہو تو اول شب میں قرآن ختم کرو،اور گرمی ہو تو ابتدائی دن میں۔تو گویا ان کو یہ اچھا لگا،اس لیے کہ طلحہ بن مصرف سے مروی ہے کہ میں نے اس امت کے ابتدائی دور کے اہل خیر کو پایا کہ وہ دن کے شروع اور رات کے شروع میں ختم کرنا پسند کرتے تھے،وہ حضرات کہتے تھے: اگر شروع رات میں ختم کرے گا،تو صبح تک فرشتے اس کے لئے دعائے رحمت کریں گے،اور شروع دن میں ختم کرے گا تو فرشتے شام تک اس کے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں،بعض

اہل علم نے کہا: مستحب ہے کہ دن میں ختم، فجر کی دو رکعتوں میں یا ان دونوں کے بعد کرے، اور رات میں ختم مغرب کی دو رکعتوں میں یا ان دونوں کے بعد کرے، ختم اول شب میں اور اول دن میں کرے۔

فصل

مستحب ہے کہ ختم کرتے وقت اپنے گھر والوں اور دوسروں کو جمع کرلے تا کہ وہ دعا میں شریک ہو جائیں۔ امام احمد نے فرمایا: حضرت انسؓ قرآن ختم کرتے وقت اپنی آل اولاد اور گھر والوں کو جمع کرتے تھے۔ یہی ابن مسعودؓ وغیرہ سے مروی ہے۔ اس کو ابن شاہین نے حضور ﷺ سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ ابوبکر نے کہا: سورہ ضحیٰ سے اخیر قرآن ہر سورہ کے اخیر میں تکبیر مستحسن ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابی کی روایت میں ہے کہ انھوں نے حضور ﷺ کو پڑھ کر سنایا تو آپ نے ان کو اس کا حکم دیا۔ اس کو قاضی نے ''جامع'' میں اپنی اسناد سے روایت کیا ہے۔

فصل

ابوعبداللہ سے دریافت کیا گیا ہے کہ ماہ رمضان میں کوئی امام، سورہ کی کچھ آیات چھوڑ دے، تو کیا مقتدی اس کو پڑھیں گے؟ فرمایا: ہاں ایسا کرلینا چاہیے۔ مکہ کے لوگوں نے ایک آدمی کو مقرر کر رکھا تھا کہ امام سے جو حروف وغیرہ چھوٹ جائیں، ان کو لکھ لے۔ اور ختم والی رات میں اس کو دہرانا تھا، ایسا مستحب اس لیے ہے تا کہ ختم قرآن مکمل ہو جائے، اور پورا ثواب ملے۔

رمضان میں آغاز قرأت:

صاحب الفروع (۴۲۰/۱) نے کہا: امام احمد نے مستحب قرار دیا ہے کہ تراویح سورہ قلم سے شروع کی جائے، اس لیے کہ سب سے پہلے یہی نازل ہوئی، اور سب سے اخیر میں سورہ مائدہ نازل ہوئی، اور سجدہ کے بعد کھڑا ہو تو سورہ بقرہ پڑھے۔ ابراہیم بن محمد بن حارث نے نقل کیا ہے کہ اس کو عشاء کی نماز میں پڑھے گا۔ ہمارے شیخ نے کہا: یہی زیادہ بہتر ہے، اور ختم قرآن کے لیے آخری رکعات کے رکوع سے قبل دعا کرے، دونوں ہاتھوں کو اٹھائے

گا۔ پہلے کو لمبی کرے گا، اس کے بعد وعظ کہے گا، ان سب کی تصریح ہے۔ اھ

تراویح میں سلف کے مختلف النوع معمولات:

صورت اول: حضرت عمرؓ کا لوگوں کو ایک امام کے پیچھے جمع کرنا۔

صورت دوم: شعبہ سے مروی ہے۔ انھوں نے اشعث بن سلیم سے روایت کیا کہ میں نے اپنی مسجد والوں کو پایا کہ امام ان کو رمضان میں پڑھاتا ہے، لوگ اس کے پیچھے پڑھتے ہیں، کچھ لوگ مسجد کے گوشہ میں تنہا تنہا پڑھتے ہیں۔

مسجد مدینہ میں حضرت ابن الزبیر کے عہد میں، میں نے لوگوں کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

صورت سوم: عہد رسالت اور اس کے بعد حضرت ابی رضی اللہ عنہ کا معمول، وہ کبھی کبھی اپنے گھر کی عورتوں کو عہد رسالت میں تراویح پڑھاتے تھے، اس کے بعد عہد عمر میں لوگوں کو تراویح پڑھائی۔ ابن ہرمز ایک قاری تھے، وہ اپنے اہل خانہ کو اپنے گھر میں تراویح پڑھاتے تھے۔

صورت چہارم: عمل قراء، شعبہ، حضرت اسحاق بن سوید سے نقل کرتے ہیں: رمضان میں بنی عدی میں قراء کی صف ہوتی تھی: امام لوگوں کو پڑھاتا، اور یہ لوگ علیحدہ پڑھتے تھے۔ اور شاید ایسا اپنے حفظ کو عمدہ کرنے کے لئے کرتے تھے۔

اسی طرح سعید بن جبیر مسجد میں تنہا پڑھتے تھے۔

صورت پنجم: جو لوگ کبھی گھر میں، اور کبھی مسجد میں پڑھتے تھے، امام مالک نے فرمایا: عمر بن حسین صاحب فضل وفقہ ہیں۔ وہ عبادت گزار تھے، ایک شخص نے مجھے بتایا کہ وہ رمضان میں ان کو روزانہ قرآن شریف شروع کرتے ہوئے سنتا تھا۔ دریافت کیا گیا: وہ ختم کر لیتے تھے؟ فرمایا: ہاں، وہ رمضان میں عشاء پڑھ کو لوٹ جایا کرتے تھے، اور ۲۳ ویں رات کو لوگوں کے ساتھ تراویح پڑھتے، اسکے علاوہ ان کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے۔

دریافت کیا گیا: ابوعبداللہ! آدمی ہر رات قرآن ختم کرے؟ فرمایا: کیا خوب! قرآن ہر خیر کا امام ہے۔

صورت ششم: قبیصہ نے کہا: سفیان نے رمضان میں میرے پیچھے ایک ترویحہ پڑھا، پھر کنارے ہو گئے، اور تنہا پڑھا، وہ اس قدر بلند آواز سے پڑھنے لگے، مجھ سے غلطی ہونے والی تھی، پھر انھوں نے میرے پیچھے ایک اور ترویحہ پڑھا، پھر اپنا جوتا لیا، اور میرے ساتھ وتر پڑھنے کا انتظار کیے بغیر چلے گئے۔

یحییٰ بن ایوب نے کہا: میں نے یحییٰ بن سعید کو دیکھا کہ وہ مدینہ میں مسجد میں امام کے ساتھ رمضان میں عشاء کی نماز پڑھتے اور لوٹ جاتے، میں نے ان سے وجہ پوچھی تو فرمایا: میں تراویح پڑھتا تھا پھر چھوڑ دیا، اگر میں تنہا پڑھ سکوں تو یہ میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔

صورت ہفتم: راحت قلب کے لئے اس کو ترک کرنا۔ صالح مری سے منقول ہے کہ ایک آدمی نے حضرت حسن سے دریافت کیا: ابوسعید! رمضان آ ہی گیا ہے۔ میں نے قرآن پڑھ لیا ہے۔ میں تنہا تراویح پڑھوں؟ یا لوگوں کے ساتھ مل کر پڑھوں؟ آپ کیا فرماتے ہیں؟ حضرت حسن نے اس سے فرمایا: تمھیں اپنے لئے اختیار ہے، دیکھ لو جہاں تمہارے دل میں خوف زیادہ پیدا ہو اور اچھی طرح بیدار رہ سکو، اسی کو اختیار کر لو۔

ابوداؤد نے امام احمد سے کہا: امام لوگوں کو مسجد میں تراویح پڑھاتا ہے، اور کچھ لوگ مسجد ہی میں تنہا پڑھتے ہیں؟ فرمایا: مجھے پسند ہے کہ امام کے ساتھ پڑھیں۔ انھوں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ ایک شخص دوبار قرآن پڑھتا ہے، رمضان میں لوگوں کی امامت کرتا ہے؟ فرمایا: یہ میرے نزدیک لوگوں کے نشاط پر موقوف ہے، ان میں کام ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت معاذ سے فرمایا: ''کیا تم فتنہ میں ڈالو گے؟''

عبادت میں محنت کی کچھ انواع:

حسن نے کہا جو یہ کر سکے کہ امام کے ساتھ پڑھے، پھر جب امام ترویحہ میں بیٹھا ہو تو جو قرآن یاد ہے، اس کو اپنے طور پر نماز میں پڑھے یہ افضل ہے، ورنہ تنہا پڑھے، اگر اس کو قرآن یاد ہوتا کہ قرآن اس کو بھول نہ جائے۔

ابن عمر عشاء پڑھ کر گھر لوٹ آتے، اور جب لوگ تراویح پڑھ کر لوٹ جاتے تو اپنی ضروری چیزیں لے کر مسجد میں پہونچ جاتے۔ فجر تک رہتے۔

نوادر وعمومات:

میمون بن مہران نے کہا: میں نے دیکھا کہ اگر قاری پچاس آیتیں پڑھتا تو لوگ کہتے: اس نے تخفیف کر دی اور میں نے رمضان میں قراء کو پایا ہے کہ وہ پورا ایک واقعہ پڑھتے تھے، مختصر ہو یا لمبا، لیکن آج تو مجھ پر ایک قاری کی قرأت نے کپکپی طاری کر دی جنھوں نے یہ آیت پڑھی (**وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِ قَالُوۡاۤ اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ**) پڑھے پھر دوسری رکعات میں یہ پڑھا (**غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡن ۔ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ**).

حسن بن عبید اللہ سے روایت ہے کہ عبدالرحمن بن اسود لوگوں کو ماہ رمضان میں شروع سے اخیر رات تک پڑھاتے تھے، وہ چالیس رکعات اور وتر پڑھاتے تھے، دو ترویحہ کے دوران بارہ رکعات پڑھتے اور سات رکعات وتر۔ درمیان میں سلام نہیں پھیرتے تھے، اور اس کے دوران کہتے تھے: ''الصلاۃ'' (یعنی نماز کیلئے تیار ہو جاؤ، ہر ترویحہ میں نفل کے بعد فرض پڑھنے کیلئے یہ کہا جاتا تھا) اور ہر رات تہائی قرآن پڑھتے تھے۔

قتادہ، ہر سات راتوں میں ایک بار ختم قرآن کرتے تھے، اور رمضان آجاتا تو ہر تین راتوں میں ایک ختم کرتے تھے اور عشرہ اخیرہ میں ہر رات میں ایک ختم کرتے تھے۔

☆☆☆☆☆